تجلی دیوبند

دینی و علمی ماہنامہ

ہیرے موتی

(۱) اپنے مسلمان بھائی کو دیکھ کر جو تبسم تیرے ہونٹوں پر آتا ہے وہ بھی صدقہ ہے۔ (الحدیث)

(۲) تجھے تیرے عیوب اور خامیوں سے آگاہ کرے وہ تیرا دوست ہے اور منہ پر تعریف کرنا گویا ذبح کر دینے کے مرادف ہے۔ (فاروق اعظمؓ)

(۳) ملنے جلنے والوں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنا سب سے پہلی نیکی ہے۔ (حضرت علیؓ)

(۴) تمہارے برے ہمنشین تمہارے سب سے بڑے دشمن ہیں۔
(شاہ ولی اللہ دہلوی)

تاریکیوں میں ایک چراغ

مدیر: عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

یہ شمارہ — 1/50

جلد ۲۰ — شمارہ ۱ و ۲

ماہنامہ تجلی دیوبند

ایڈیٹر عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

پاکستان کا پتہ:-

مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸۰ مینا بازار
پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی
(مغربی پاکستان)

پاکستانی حضرات:-

مندرجہ بالا پتہ پر منی آرڈر بھیجکر وہ رسید ہمیں بھیجدیں جو منی آرڈر کرتے وقت ڈاکخانہ سے ملتی ہے۔

ہمارا مکمل پتہ:- دفتر تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

ہندوپاک سے سالانہ چندہ
دس روپے

دیگر ممالک سے:- بذریعہ بحری ڈاک
ایک پونڈ
〃 بذریعہ ہوائی ڈاک دو پونڈ
پونڈ پوسٹل آرڈر کی شکل میں سادہ بھیجئے
ان پر کچھ بھی لکھنے کی ضرورت نہیں۔

اگر اس دائرے میں سرخ نشان ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس پرچہ پر آپ کی خریداری ختم ہے — یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں۔ آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں۔ خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائے گا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا (وی پی دس روپے ستر پیسے کا ہوگا) منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

اس پرچے کی قیمت
ایک روپیہ پچاس پیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست مضامین مارچ و اپریل ۱۹۶۸ء

آغاز سخن	عامر عثمانی	۵
کیا ہم مسلمان ہیں؟	شمس نوید عثمانی	۲۳
تفہیم القرآن	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	۲۷
تفہیم حدیث	″ ″	۳۵
تجلی کی ڈاک	عامر عثمانی	۴۳
مولانا مودودی کا نامۂ گرامی	(ماخوذ)	۵۳
شام کی حزب البعث	جناب خلیل حامدی	۵۹
مولانا مودودی کی مجلس	(ماخوذ)	۷۷
برید فرنگ	جناب خورشید احمد	۸۳
حاشیوں پر حاشیے	ملا ابن العرب مکی	۹۳
حسن البنا شہیدؒ کی ڈائری	(ایشیا۔ لاہور)	۹۶
مسجد سے میخانے تک	ملا ابن العرب مکی	۹۹
کھرے کھوٹے	عامر عثمانی	۱۱۲

عامر عثمانی پرنٹر پبلشر نے "نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند" سے چھپوا کر اپنے دفتر تجلی دیوبند سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغازِ سخن

جب سفرِ حج کے لئے رختِ سفر باندھ رہے تھے تو ارادہ تھا کہ پورے سفر میں روزنامچہ لکھنے کا التزام کریں گے۔ روزنامچے ہی کو شاید ڈائری بھی کہتے ہیں۔ ڈائری لکھنا تو بعض لوگوں کے معمولاتِ زندگی میں شامل ہوا کرتا ہے مگر ہماری بے توفیقی دیکھئے کہ ارادے کے باوجود سفرِ حج تک کی ڈائری نہ لکھ سکے۔ بے توفیقی کے سوا اسے آخر اور کیا کہیں گے کہ قلم جیب میں اور کاغذ بیگ میں موجود، فرصت اور موقع بھی مہیا، کوئی دشواری اور رکاوٹ بھی آس پاس نہیں مگر انگلیوں کے قلم تک اور قلم کے کاغذ تک پہنچنے کی نوبت نہ آسکی۔ روزانہ کا التزام تو کجا کسی ایک دن کی ڈائری بھی قلمبند نہ کر سکے۔ اب سفرِ حج پورا کر کے گھر لوٹے ہیں تو سوچ رہے ہیں کہ کیا کیا لکھیں اور کیسے لکھیں۔ ۱۸ر فروری کو دیوبند سے چلے تھے ۷ر اپریل کو پھر دیوبند ہی میں نظر آرہے ہیں۔ پچاس دنوں کی مفصل روداد یوں تو سیکڑوں صفحات پر پھیل سکتی ہے مگر بار بار خیال آتا ہے کہ آخر ضرورت ہی کیا ہے اس داستان سرائی کی۔ حج کا سفر کوئی انوکھا سفر تو نہیں۔ ہر سال لاکھوں ہی مسلمان اس سفر کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ پھر بہتیرے ان میں ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنی اپنی روداد سفر لکھ ڈالی ہے اور ہر روداد زیادہ سے زیادہ پانچ سات روپے خرچ کر کے بازار سے مل بھی جاتی ہے۔ پھر کیا خاص بات ہوئی اگر عامر عثمانی نے بھی ایک عدد سفرِ حج کر ہی ڈالا اور کیا حاصل ہوگا اگر اس سفر کے معروف و معلوم مراحل کی کہانی بہت سے صفحات کالے کر کے سنا ہی دی گئی۔

خیر۔ اگر ہم اپنے حج میں کوئی خصوصیت، کوئی شانِ تازگی، کوئی ندرت و انفرادیت محسوس کرتے تو یہ سوچ بھی سکتے تھے کہ اسی خصوصیت و انفرادیت کو نمایاں کرنے کے لئے سفرنامہ تالیف کر دیں لیکن خصوصیت و انفرادیت تو درکنار یہاں تو یہ تک یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ جو کچھ ہم کر آئے ہیں وہ واقعتہً حج ہے بھی یا اسے صرف "حج کی نقل" کہنا چاہیئے۔

حج ایک عبادت شاقہ کا نام ہے۔ کسی نہ کسی مرحلے میں تھکن، دشواری، تعب اور سرگشتگی سے دوچار ہونا اس کے لوازمات ہی میں سمجھئے۔ لیکن ہم اس پورے سفر میں نہ کسی دشواری اور پریشانی سے ہمکنار ہوئے۔ نہ کوئی منزل تعب اور خستگی کی آئی۔ گھر سے نکلے تھے تو ہر طرح کا سامانِ آسائش ہمرکاب تھا۔ جدہ کے ادارے کے ناظم ہمارے چھوٹے بھائی عمر فاروق سلمہٗ نے دفتر کے ایک کارکن کو بمبئی تک کے لئے ہمارا ہم سفر بنا دیا تھا کہ راستے بھر وہ ہمیں اپنی خدمات سے مستفید کرتے چلے جائیں۔ بڑے لوگ نوکر چاکر رکھتے ہیں۔ شیوخ و مرشدین کا بارِ خدمت اٹھانے کے لئے خدام کی کمی نہیں۔ لیکن ہم نہ تو بڑے لوگوں میں شامل تھے نہ شیوخ و مرشدین میں۔ پھر اسے تکلفِ بے جا نہیں کہیں گے تو اور کیا کہیں گے کہ نل سے پانی بھرنے اور ناشتہ دان سے کھانا نکالنے کے بھی ایک معاون ساتھ ہو۔ لیکن تقدیرِ الٰہی جو کچھ ہوتی ہے اس کے اسباب و وسائل تو خود بخود ہی ظہور پذیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

بمبئی اترے تو وہاں بھی آرام و راحت ہمارے لئے آغوش کھولے کھڑے تھے۔ کیو پریس کے منیجر جناب غلام قادر صاحب کی اسٹیشن تشریف آوری تو خیر متوقع تھی ہی لیکن حلقۂ بمبئی کے امیر جماعت

جناب شمس پیرزادہ اور مکتبۂ اسلامی کے منیجر جناب شہاب بانکوٹی بھی اتنے سویرے بمبئی سینٹرل پہنچ جائیں گے اس کا تصور تک نہ تھا۔ ان حضرات کو اپنے پروگرام کی کوئی اطلاع ہم نے نہیں دی تھی۔ انھیں اسٹیشن موجود پاکر ایک غیر متوقع مسرت اور اطمینان کا احساس کیسے نہ ہوتا۔ پھر اس احساس میں تحیّر کا اضافہ بھی ہوگیا جب جناب ڈاکٹر عبدالکریم نائک کی سبک رفتار کار نے ہمیں ہمارے سامان سمیت اپنے اندر سمو لیا۔ تحیّر کی وجہ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی نہ صرف شخصیت بلکہ نام تک سے ہم واقف نہ تھے۔ یہ سب تو بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کون ہیں اور کن اوصاف کے مالک ہیں۔ سفرنامہ لکھ رہے ہوتے تو ہم تفصیل سے ان کا تعارف کراتے لیکن بحالتِ موجودہ بس اتنا ہی کافی سمجھئے کہ وہ ایک اچھے ڈاکٹر ہیں جن کی ڈسپنسری میں مریضوں کا ہجوم رہتا ہے۔ ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ایک مصروف اور کامیاب ڈاکٹر ہونے کے باوجود ان کے قلب و ذہن کا رشتہ قوم و ملت کی فلاح اور علمی و معاشرتی خدمات کے تصور اور جذبے سے مضبوطی کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ وہ بڑا دردمند دل اور بہت فیّاض طبیعت رکھتے ہیں۔ ان کے ذہن میں شاید ہر وقت ہی یہ تڑپ کسی نہ کسی درجے میں موجود رہتی ہے کہ کونسا طریقہ ہو جس سے ملّی مسائل کی گرہیں کھل سکیں اور مسلمانوں کی پس ماندگی اصلاح و ترقی کے رُخ پر چل سکے۔

انھوں نے سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ پیشکش کی کہ میرے ہی گھر قیام کیا جائے۔ لیکن ہم چونکہ تجلّی میں کیو پریس کا اعلان کر چکے تھے اس لئے شکریہ کے ساتھ معذرت کر دی گئی اور پھر ان کی خوش خرام گاڑی نے چند ہی منٹ میں ہمیں کیو پریس پہنچا دیا۔

جہاز جدّے کے لئے ۲۴ر فروری کو اُڑنا تھا اور بمبئی ہم ۲۰ر کو اُترے۔ ان پانچ دنوں میں پاسپورٹ وغیرہ کے مراحل طے ہونے تھے۔ یہ پانچ دن کیسے گذرے۔ اس کے متعلق بس اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ پھولوں کی سیج پر گذرے۔ ضیافتیں، تحفے، علمی و ادبی نشستیں، سیر و تفریح۔ ڈاکٹر نائک صاحب تو ایک روز رات کے ایک بجے تک اپنی گاڑی میں نہ جانے کہاں کہاں گھماتے پھرے۔ وہ ازراہِ مہمان نوازی مختلف مقامات کے نام بتاتے جا رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ہمیں ان میں سے ایک بھی نام یاد نہ ہو۔ یاد نہ رہنے کی وجہ حافظے کی خرابی نہیں۔ حافظہ بیچارہ کیا کرتا جب دل اور دماغ دونوں کسی اور ہی دنیا میں گم تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان پانچ دنوں میں حصّہ ہم نے بظاہر سارے ہی مشاغل میں لیا لیکن قلب و ذہن کی تمام تر توجہ اُن آنے والی ساعتوں کی طرف مرکوز رہی جب ہمارا جہاز اُڑ کر سرزمین حجاز پر اُترے گا اور آنکھیں ان مقاماتِ محبوبہ کے نظارے سے شرف یاب ہوں گی جن کے دھندلے تصوراتی خاکے نہ جانے کب سے ہماری روح کے نہاں خانے میں قوسِ قزح کے حسین رنگوں کا تانا بانا پھیلائے ہوئے ہیں۔

یہ تصور کی دنیا بھی عجیب ہے۔ بمبئی کی سربفلک عمارتیں اور دل کش تفریح گاہیں سامنے تھیں مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے ان سب پر دبیز کُہرے کے غلاف چڑھے ہوئے ہوں۔ جیسے یہ بہت دور ـــــ ہزاروں میل دور واقع ہوں اور ہم بس عالمِ خواب میں ان کا نظارہ کر رہے ہوں۔ اگر طائرِ تخیل ہم سے پہلے دیارِ حبیب کی طرف نہ اُڑ گیا ہوتا تو ظاہر ہے کہ عروس البلاد بمبئی کی تفریحات سے کس کافر کا دل بیزاری کی حد تک بے تعلقی محسوس کر سکتا تھا۔ دُور نہ جائیے۔ ابھی واپسی میں جب چھ دن ہم بمبئی ٹھیرے ہیں تو کیفیت یکسر بدلی ہوئی تھی۔ اب ہر چیز اپنی عام شکل میں نظر آئی۔ وہی رعنائیاں، وہی جذب و کشش، وہی کافر ادائیاں جو عروسِ دنیا کا طرۂ امتیاز ہیں۔ خشوع و وارفتگی، زہد و تقویٰ اور سوز و گداز کی ساری کیفیتیں شاید ہزاروں فٹ کی ان بلندیوں سے گر کر چکنا چور ہو چکی تھیں جن کے دوش پر ہوائی جہاز ہمیں اڑا کر جدّے سے بمبئی لایا تھا۔ دبیز کُہرے کے وہ غلاف جنھیں ابھی ایک ماہ قبل ہم نے بمبئی کی ہر عمارت اور ہر تفریح گاہ پر چڑھا ہوا دیکھا تھا اب کہیں نظر نہ آتے تھے۔

ہو سکتا ہے اس میں ہماری اعصابی کمزوری کو بھی دخل ہو۔ حقیقت بہرحال یہی تھی کہ جسم بمبئی میں تھا اور دل و دماغ کہیں اور۔ پاسپورٹ اور دیگر متعلقہ اُمور کی آئینی تکمیل کے سلسلے میں مسافر خانہ صابو صدیق پہنچے تو

وہاں حجاج کا اتنا ہجوم تھا کہ ہچکولے کھائے بغیر راہداری سے گذرنا مشکل تھا۔ شور، ہلچل، ہنگامہ۔ اب شاید ہمارے لئے بھی تعب اور ابتلا کی منزل آ ہی پہنچی تھی۔ مگر نہیں۔ ابھی چند منٹ بھی تو نہ گذرے ہوں گے کہ ایک ایسے بندۂ خدا سے ملاقات ہوگئی جس کی مخلصانہ نوازشات نے ہمارا سارا غم دور کر دیا۔ یہ تھے مولانا محی الدین منیری۔ جوائنٹ سکریٹری مجلس خدام النبی۔ انھوں نے جس تپاک، سرگرمی اور محبت سے ہمارے سارے کام خود چل پھر کر کرا دیئے اس کی یاد زندگی بھر دل سے محو نہ ہوگی۔ محاورے میں یوں سمجھئے کہ ہم تو نوابی کرتے رہے اور ضابطے کے تمام مراحل مولانا موصوف کی خاص توجہ سے آناً فاناً طے ہوتے چلے گئے۔ ہزاروں ہزار حاجیوں کی بھیڑ میں کون ہے جسے متعلقہ مراحل طے کرنے میں تھوڑے بہت انتظار، تعب، صبر اور جسمانی و ذہنی جھٹکوں سے سابقہ نہ پیش آتا ہو۔ فقط بحری جہاز والوں ہی کی بات نہیں، ہوائی جہاز والے حجاج کو بھی ہم نے بعض مراحل میں لائن میں کھڑا دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ باوجود موسم گرم نہ ہونے کے وہ رومال سے ماتھے اور گردن کا پسینہ پونچھ رہے ہیں۔ لیکن مولانا منیری کے حسنِ اخلاق نے ہمارے لئے وہ مسیحائی کی کہ کسی بھی مرحلے پر ہمیں ادنیٰ درجے میں بھی نہ صبر و انتظار کی کلفت اٹھانی پڑی نہ لائن میں لگنا پڑا نہ دوڑ دھوپ کی نوبت آئی۔ یوں سمجھئے کہ جیسے اور سب حاجی تو حاجی تھے اور ہم محض تماشائی۔ جو کسی آسودہ حال امیر کی طرح آرام کرسی پر نیم دراز فقط لطفِ تماشا اٹھا رہا ہو۔

مگر ٹھیریئے۔ یہاں ایک ایسا واقعہ بھی پیش آیا جس نے ہمارا کم سے کم پانچ تولے خون تو خشک کر ہی دیا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ جس رحیم و کریم آقا نے ہمارے لئے اس پورے سفر میں آسانیاں ہی آسانیاں اور راحتیں ہی راحتیں مقسوم فرما دی تھیں اس کی حیرت ناک کارسازی نے عین اسی وقت ایک ایسا واقعہ بھی رونما کر دیا جس کی وجہ سے اس خشک شدہ خون کی فوری پیدائش میں دیر نہیں لگی۔ دونوں واقعات آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے حاضر خدمت ہیں۔

قرنطینہ اور ٹیکوں وغیرہ کے مراحل طے ہو گئے تھے۔ ابتدائی ضوابط کا پیٹ بھرا جا چکا تھا۔ اب مرحلہ تھا تو فقط یہ کہ پاسپورٹ اپنے ہاتھ میں آجائے اور اطمینان حاصل ہو کہ اب ہم حج کے لئے روانہ ہو سکیں گے۔ مولانا منیری کی یقین دہانی کے مطابق یہ مرحلہ بھی اب منٹوں میں طے ہو جانا تھا چنانچہ انھی کی معیت میں خراماں خراماں اوپر پہنچے۔ تیار شدہ پاسپورٹ جو حضرات تقسیم کر رہے تھے ان سے مولانا منیری کی نہ صرف جان پہچان تھی بلکہ خاصی بے تکلفی بھی تھی بلکہ جہاں تک یاد پڑتا ہے ایک صاحب ان کے قرابت دار بھی تھے۔ دفتر میں پہنچتے ہی مولانا نے ہمارا پاسپورٹ طلب اور متعلقہ کارکن نے ان کے الفاظ سنتے ہی پاسپورٹوں کے ڈھیر کی طرف توجہ دی۔

ہمیں مولانا نے اس دفتر کی ایک کرسی پر بٹھا دیا تھا۔ بیٹھنے کو ان کے حکم سے بیٹھ تو گئے لیکن اضطراب شوق کا یہ عالم تھا کہ کرسی جیسے چٹکیاں بھر رہی ہو۔ کارکن موصوف نے پاسپورٹوں کی ایک دو گڈیاں الٹیں پلٹیں اور ہم غیر ارادی طور پر اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے کہ اب ہمارا پاسپورٹ ڈھیر سے جدا ہوا اور اب ہم نے اسے بہ ہزار شوق سینے سے لگایا۔

باقاعدہ نام زدگی کے بعد پاسپورٹ کا مسئلہ حجاج کے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ حج کمیٹی سے اجازت مل چکی ہو تو پاسپورٹ بھی بے چون و چرا مل ہی جاتا ہے۔ مگر ہماری ذہنی حالت نارمل نہیں تھی۔ وفورِ شوق کہئے یا ضعفِ اعصاب۔ ہم بہر حال اندیشہ ہائے دور و دراز کا شکار تھے ہمارا اندرونی اضطراب رہ رہ کر ہمیں اس وسوسے کا خوفناک چہرہ دکھا رہا تھا کہ کیا عجب ہے جس سرکار والا تبار نے ہمیں پاکستان کا پاسپورٹ دینے سے انکار کر دیا ہے وہ ہمارے حج کو بھی کسی وطن دشمن سازش کی کڑی تصور کر کے حکم امتناعی کی دیوار کھڑی کر دے۔

کارکن موصوف نے پاسپورٹوں کے کئی ڈھیر الٹ پلٹ کر

الماری میں رکھ دیئے۔ پھر الماری کے دوسرے خانوں کی طرف توجہ دی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ متوقع ڈھیروں میں ہمارا پاسپورٹ نہیں مل سکا ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی ہم پھر کرسی پر بیٹھ گئے۔ مولانا منیری رہ رہ کر ہماری طرف دیکھ لیتے تھے اور ہماری حالتِ زار کا اندازہ کر کے کچھ تسلیاں بھی دیتے جاتے تھے۔ ان کی تسلیوں ہی کے صدقے کئی بار ہم نے اس خوشگوار تصور کا لطف اُٹھایا کہ ہمارا پاسپورٹ الماری سے پھدک کر ہمارے ہاتھ میں آگیا ہے اور ہم اسے مضبوطی کے ساتھ سینے سے لگائے دیارِ حبیب میں جا اُترے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے تصور کی یہ دنیا پھیلتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ بمبئی اور یہ دفتر جہاں ہم اس وقت بیٹھے تھے اس کی وسعتوں میں اس طرح گم ہو گئے جیسے ریت کے ڈھیر میں رائی۔ افق سے افق تک اگر کوئی چیز پھیلی ہوئی تھی تو وہ تھی خیالی دنیا کی وہ ہفت رنگی دھنک جس کے پیش منظر میں بیت اللہ کی چوکور عمارت اور مسجدِ نبویؐ کے پہلو میں نظر آنے والے سبز گنبد کا ہیولیٰ ایسا نظر آرہا تھا جیسے خواب کی حالت میں کوئی فراق زدہ عاشق اپنے محبوب کی جھلکیاں دیکھ رہا ہو۔ جدّے سے مکّے اور مکّے سے مدینے کا سفر آن کی آن میں طے ہو رہا تھا۔ پہاڑ اور وادیاں، صحرا اور نخلستان، اونٹوں کی قطاریں اور بکریوں کے گلّے برقی سرعت سے تخیل کے اسکرین پر دوڑے جا رہے تھے اور خیالی دنیا کی قوسِ قزح ان پر اپنے سات رنگوں کی پرچھائیاں اس طرح ڈال رہی تھی جیسے کوئی ہفت رنگا گلوب مسلسل گھوم رہا ہو۔

یہ مت سمجھئے کہ بیت اللہ اور مسجد نبویؐ کو ہم پہلے کبھی دیکھ آئے ہیں۔ نہیں یہ سفر تو ہمارا پہلا ہی سفر تھا۔ تخیل کے اسکرین پر جو کچھ آیا وہ یا تو ان تصویروں کا عکس تھا جو ہم اور آپ بچپن ہی سے اپنے گھروں اور بازاروں میں دیکھتے آئے ہیں یا پھر یہ اُن کتابی معلومات کے ٹیلی ویژنی سائے تھے جنھیں ہم نے اور آپ نے زندگی میں نہ جانے کتنی بار پڑھا ہے۔ اسی لئے ان میں واقعیت کے ساتھ ساتھ افسانویت بھی موجود تھی۔ افسانویت کا ادراک ہمیں اس وقت ہوا جب جدّے، مکّے اور مدینے کی پختہ اور نفیس سڑکوں پر اونٹوں اور بکریوں کے عوض ہمیں جدید سے جدید ماڈلوں کی چمچماتی ہوئی کاریں اور بسیں نظر آئیں۔ ان میں شیورلیٹ کی وہ امپالا بھی تھی جو اپنی قیمت کے لحاظ سے کم و بیش دس اونٹوں اور کئی سو بکریوں کا بدل ہو سکتی ہے۔ ان میں وہ کیڈلاک بھی تھی جو تاریخ کے قافلے کو اونٹوں کی رفتار سے بیس پچیس گنا زیادہ رفتار کے ساتھ ان تیل کے چشموں کی طرف لے جا سکتی ہے جن کے طلسماتی بہاؤ نے اونٹوں اور بکریوں کی کوکھ سے موٹریں اور ہوائی جہاز پیدا کئے ہیں۔ ان میں وہ پلے ماؤتھ بھی تھی جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا ہوا بیس سال کا سیاہ فام لڑکا بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ صرف پانچ گھنٹے میں وہ آپ کو مکّے سے مدینے پہنچا دے گا۔ پاسپورٹ ملتے ہی جس دنیا میں پہنچنے کا تصور ہمارے خیالوں کی بستی میں اپنا ریشمی دامن پھیلا رہا تھا اس میں بازاروں کے نقشے، مکانوں کے خاکے اور معاشرے کا رنگ روپ سراسر افسانوی ہی تھا۔ اس کا ادراک بھی اس وقت ہوا جب ہم نے جدّے، مکّے اور مدینے کی شاہراہوں پر آسمان سے باتیں کرتی ہوئی ان نو تعمیر بلڈنگوں کو دیکھا جو مشرقی مزاج و مذاق پر مغربی تہذیب و تمدّن کی ہمہ گیر فتح کا اعلان بالجہر ہیں۔ جن کا شکوہ ہم جیسے نئے اور ضعیف الاعصاب حاجیوں کے خیالی شیش محلوں پر پہاڑ بن کر ٹوٹتا ہے۔

دفعتاً ایک زہرہ گداز اطلاع نے ہمارے خیالات کی حسین دنیا پر بجلی گرائی۔ کوئی کہہ رہا تھا:۔

"پاسپورٹ تو نہیں ملا ــــ خدا جانے کہاں گیا۔"

ہم چونکے۔ چونکے نہیں یوں کہئے تڑپے۔ تڑپنے کا لفظ بھی اُس لرزہ خیز کیفیت کی ترجمانی کا حق ادا نہیں کر سکتا جس کا ہزاروں من وزن اس وقت ہماری سماعت نے اور سماعت کے واسطے سے دل و دماغ نے محسوس کیا تھا۔ ایک نیم کش تیر تھا جو دل و جگر سے گذرتا ہوا روح میں ترازو ہو گیا۔

"کیا کہا ــــ پاسپورٹ نہیں ملا ــــ!" ہماری آواز شاید کانپ رہی تھی۔ کانپ نہ رہی ہو گی تو وہ ایسی ضرور ہو گی جسے کسی نزع گرفتہ کی دردناک ہچکی کہا جا سکے۔

"ذرا اچھی طرح دیکھو" ــــ یہ مولانا منیری کی آواز تھی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ مولانا خود بھی پاسپورٹ کی تلاش میں شامل ہو گئے

ہیں۔ بہتیرے حاجی اپنے اپنے پاسپورٹوں کے سلسلے میں یہاں ہجوم کئے ہوئے تھے۔ ملی جلی آوازوں سے کمرہ گونج رہا تھا۔ وہ سب غالباً اس پر احتجاج کر رہے ہوں گے کہ ان پر توجہ دینے کے عوض سرنیے کسی ایک ہی شخص کے معاملے پر توجہ کیوں منعطف کر دی ہے۔ غالباً ہم اس لئے کہہ رہے ہیں کہ سچی بات یہ ہے اس وقت ہمارا دماغ کسی بھی آواز اور فقرے کا مفہوم اخذ کرنے اور پھر اسے یادداشت کے خانے میں پہنچانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہاں تو بس ایک ہی صدا گونج رہی تھی:۔

"پاسپورٹ نہیں ملا ـــــ پاسپورٹ نہیں ملا ـــ"

خالی خالی آنکھوں سے ہم نے مولانا منیری کی طرف دیکھا۔ پھر ان کارکنوں پر نگاہ ڈالی جو ہمارے پاسپورٹ کا سراغ نہ پانے پر حیرت اور بیچارگی کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ وہ نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ پاسپورٹ کہاں گیا۔ کیوں گیا۔ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

مولانا منیری ہمیں ساتھ لئے نیچے اترے اور خدام النبی کے دفتر میں بٹھا کر پیہم تسلیاں دیتے رہے کہ گھبرائیے مت۔ میں پھر تلاش کراؤں گا۔ پاسپورٹ کہیں ادھر اُدھر ہو گیا ہے۔ مل جائے گا ـــ جائے گا کہاں۔ کوئی فکر کی بات نہیں وغیرہ۔

لیکن ایسی تسلیاں طبیعت کے اس اندرونی ردِ عمل کو تو نہیں روک سکتی تھیں جس کی آنچ میں شریانوں میں دوڑنے والا خون بوند بوند کر کے جلنا شروع ہو گیا تھا۔ کس کا قلم ہے جو اس وقت کی کیفیات کا ٹھیک ٹھیک نقشہ کھینچ سکے۔ زندگی میں بارہا آزمائشوں، صدموں اور دشواریوں سے واسطہ پڑا ہے مگر یاد نہیں پڑتا کہ اندوہ اور مایوسی کی ایسی غیر معمولی کیفیت بھی کبھی دل و دماغ پر طاری ہوئی ہو۔ اخلاقاً مولانا سے عرض بہرحال یہی کرنا تھا کہ جی ہاں۔ انشاء اللہ مل ہی جائیگا۔ اللہ مالک ہے۔ اسی کی مشیت پر بندے کو راضی رہنا چاہیئے وغیرذلک۔ مگر اندر ہی اندر نیچے سے اوپر تک ایک آندھی سی چل رہی تھی۔ ایک بھونچال سا برپا تھا۔ چائے نوش کی تو ایسا لگا جیسے خونِ جگر پی رہے ہوں۔ کوکا کولا منہ کو لگایا تو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ پر تیل بن کر گرا ہو۔ ہم تھے یا ہماری جگہ ایک بے صبرا بچہ جو کسی خوش رنگ کھلونے کی دھن میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا ہو۔ غصہ ق تھا تو بس اتنا کہ بچہ تو روتا ہے، چیختا ہے، ہاتھ پیر پٹختا ہے مگر ہم بظاہر ساکت و صامت تھے۔ مبہوت اور مہر بہ لب تھے۔ لیکن رونے چیخنے اور ہاتھ پیر پٹخنے کا عمل حقیقتہً ہمارے قلب و ذہن کے نہاں خانوں میں مسلسل جاری تھا۔ بڑی ندامت ہوئی یہ سوچ کر کہ بایں ریش و بروت ہم آج بھی بچے ہی ہیں۔ ایسے بچے جس کے اعصاب کچے دھاگے سے زیادہ کوئی شکیبائی نہ رکھتے ہوں!

مولانا نے دلاسا دیا ـــ اور اس وقت دلاسا دینے والوں میں انجمن خدام النبی کے دوسرے جوائنٹ سکریٹری جناب اسمٰعیل ہاشم صاحب اور صدرِ انجمن جناب محمد حسین توفیق بھی شامل تھے ـــ کہ آپ ہراساں نہ ہوں۔ اطمینان سے قیام گاہ پر تشریف لے جائیں۔ شام کو پاسپورٹ پھر تلاش کیا جائے گا اور اگر نہ ملا تو دوسرا بنوا دیا جائے گا۔

عقل اگر ٹھکانے ہوتی تو ان تینوں حضرات کی اخلاص بھری تسلیاں اتنی مؤثر تو بہرحال ثابت ہونی ہی چاہئیں تھیں کہ اگلی صبح تک ہم اندیشوں کی پیہم جراحت کاریوں سے مامون رہتے مگر عقل جب جذبۂ شوق کی گرفت میں آجاتی ہے تو وہ ایک عضوِ معطل سے زیادہ کچھ نہیں رہ جاتی۔ شاید اسی حالت کا نام شاعروں نے جنوں اور ڈاکٹروں نے مالیخولیا رکھا ہے۔ شوقِ فراواں کی مثال بہتے ہوئے دریا کی سی ہوتی ہے۔ اس کے آگے دفعتاً دیوار اٹھا دیجئے تو موجوں کا سکون خروش میں تبدیل ہو جائے گا اور یہ پُر خروش موجیں کسی زخمی درندے کی طرح دیوار سے سر ٹکرائینگی اسی طرح کی کیفیت اگر کسی جیتے جاگتے انسان کے اندر یوں میں برپا ہو جائے تو خود سوچ لیجئے کہ اس سے شکیب و تحمل اور فراست و دانش مندی کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔

وہاں سے اُٹھ کر ہم قیام گاہ تک پہنچ تو گئے اور پہنچنے کے بعد رات کے بارہ بجے تک مہمان نوازیوں کے گوناگوں مراحل سے بھی گذرتے ہی رہے لیکن حالت بس

ایسی ہی تھی جیسے سوتے میں چل پھر رہے ہوں۔ جگ مگ کرتی ہوئی بمبئی سوگوار نظر آرہی تھی۔ ٹریفک کے غیر منقطع شور کا زیر و بم کسی غم انگیز نغمے کی دھن بن کر سماعت پر سوز و گداز کی بارش کر رہا تھا۔

شام کو مولانا منیری سے پھر ملاقات ہوئی۔ ہوئی کیا یوں کہیئے ہم خود دوڑے گئے۔ انھوں نے پورے وثوق سے بتایا کہ پاسپورٹ کے متعلق جہاں تک تمھارے اندیشوں کا تعلق ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تفتیش کر چکا ہوں پاسپورٹ اگرچہ بعد کی تلاش میں بھی نہیں مل سکا ہے اور یہ بھی پتا نہیں لگا کہ وہ ناپید کہاں ہو گیا مگر پریشانی کی ضرورت نہیں۔ صبح بھی اگر نہ مل سکا تو نیا بنوا دیا جائیگا۔

"جزاک اللہ" ـــــ جواب میں ایسا ہی کوئی فقرہ ہماری زبان سے نکلا ہوگا۔ یقین سے اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ ان چند ایام کی یادیں یادداشت کی لوح پر کچھ ایسی گڈمڈ ہو گئی ہیں جیسے کسی بچے نے کرم کانٹے بنا دیئے ہوں۔ ابھرا ہوا اگر کوئی نقش ہے تو بس یہ کہ پاسپورٹ کی طلسمی گمشدگی نے ہمارا حال پتلا کر دیا تھا۔ ہم ایسے دل گرفتہ تھے جیسے ساری عمر کی کمائی کسی نے لوٹ لی ہو۔

رات ایسے عالم میں گذری کہ نہ بیداری نہ خواب۔ عقل ـــ جسے شوقِ فراواں نے بری طرح کچل کر رکھ دیا تھا ـــ کسمسا کر کہہ رہی تھی کہ نادان۔ اگر پاسپورٹ نہ ملنے کی وجہ سے تمھارا سفر منسوخ ہی ہو گیا تو رنج و ملال کی اس میں کیا بات ہے۔ یہ تو نفع کا سودا ہے۔ بہت سے پیسے بھی بچے اور حج نہ کرنے کی بازپرس کا خطرہ بھی نہ رہا۔ بازپرس تو استطاعت کی شرط سے ہے۔ استطاعت کہاں پائی گئی جب سفر کا اجازت نامہ ہی اربابِ اختیار نے عطا نہیں فرمایا۔

مگر دلِ پُر شوق کہہ رہا تھا کہ اے بدنصیب! تم سیاہ بخت ہو۔ راندۂ درگاہ ہو۔ رو سکتے ہو تو اتنا رو کہ دل خون ہو کر آنکھوں سے بہہ جائے۔ بین کرو۔ سینہ پیٹو۔ حرمین کی بارگاہِ قدس میں تمھاری حاضری مالک الملک کو پسند نہیں۔

آدمی کتنا جلد باز ہے۔ کتنا بے صبرا اور ناشکرا۔

خیالات کی یہ کشمکش تمام ہی رات جاری رہی۔ اس میں شک نہیں کہ نیند کچھ نہ کچھ آ ہی گئی تھی لیکن نیند میں بھی یہ احساس کسی نہ کسی درجے میں موجود ہی رہا کہ گرم بگولوں جیسی کوئی چیز قلب و دماغ کے نہاں خانوں میں پیہم گردش کر رہی ہے۔

صبح نماز تو جیسے تیسے پڑھ لی تھی اور شاید ایک پیالی چائے بھی زہر مار کی تھی۔ مگر پھر وہی ہم تھے اور وہی مولانا منیری۔ صابو صدیق مسافر خانہ ہماری قیام گاہ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ پیدل چلیں تو مشکل سے پندرہ منٹ کا راستہ پیدل چلنے کی ہمیں مشق بھی بہت ہے مگر عجلت کا بھوت تو سر پر سوار تھا۔ ٹیکسی پکڑی اور مسافر خانے جا پہنچے۔ حالاں کہ بس فقط دس پیسے میں پہنچا دیتی اور بس میں بیٹھنا ہم جیسے چھوٹے آدمی کے لئے کوئی توہین کی بھی بات نہیں۔ مگر ایسے نکات اس وقت سوجھ ہی کسے رہے تھے۔ مولانا منیری کا حسنِ اخلاق کہیئے کہ اتنے سویرے پہنچنے پر انھوں نے ماتھے پر بل نہیں ڈالے ورنہ اتنے سویرے کسی دفتر کے کھلنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا تھا۔

"پاسپورٹ رات بھی ڈھونڈا مگر نہیں ملا۔" وہ گویا ہوئے "اب آفس کھل جائے تو پھر ڈھونڈتے ہیں ـــ اور اگر اب بھی نہ ملا تو دوسرا بنوائیں گے۔"

اب ہمیں تقریباً دو گھنٹے انتظار کرنا تھا۔ چائے بمبئی کے ہوٹلوں کی ہمیں یوں بھی پسند نہیں۔ کریلا اور نیم چڑھا۔ ایک تو وہ جو شاندے کی طرح مسلسل اونٹتی رہتی ہے دوسرے دودھ کی جگہ پاؤڈر۔ تلخابے کے علاوہ اسے کچھ کہنا مشکل ہی ہے۔ پھر لیجیے ہم چائے سامنے رکھ کر بیٹھ ہی گئے مگر کہاں تک ایک پیالی سے سر ماریں گے بسکٹ یا سلیس منھ میں رکھتے ہیں تو وہ حلق سے نیچے اترنے کا نام نہیں لیتے۔ معدہ غالباً گہری نیند سو رہا ہے۔ اشتہا کا دور دور پتہ نہیں۔ مولانا منیری دوسرے کاموں میں لگ گئے ہیں وہ یہاں تنہا ہمارے لئے تو مقیم ہیں ہی نہیں۔ بیشمار دوسرے

حجاج کی گوناگوں خدمات انھیں انجام دینی ہیں۔ ہم تقریباً نصف گھنٹہ چائے کی میز پر بر باد کر کے مسافر خانے کی راہداریوں میں ٹہل رہے ہیں۔ ٹہل کیا رہے ہیں دھکے کھا رہے ہیں۔ بھیڑ بہت ہے۔ شور بہت ہے۔ کبھی ہم دفاتر کے بند دروازوں پر بے معنی سی نگاہیں ڈال کر چند ثانیے پیروں کی حرکت روک دیتے ہیں۔ کبھی زینوں پر چڑھتے اور اُترتے ہیں۔ کبھی سیڑھیاں گنتے ہیں کہ شاید اسی طرح دل بٹ جائے۔ کلائی کی گھڑی اور مسافر خانے کا کلاک ـــ دونوں چل تو رہے ہیں مگر نہ چلنے کے برابر۔ سوئیاں آگے کو کھسکتی ہی نظر نہیں آتیں۔ اُکتا کر پھر قریب کے ہوٹل میں جا بیٹھتے ہیں۔ اب چائے کے تو تصور ہی سے طبیعت بیزار ہے۔ کوکا کولا پینے کے لئے پیاس چاہیئے۔ پیاس کا برائے نام بھی احساس نہیں۔ حالانکہ ہونٹ خشک ہیں، سر جل رہا ہے۔ شاید بخار ہو گیا ہے۔ پورے جسم میں گرم گرم سی لہریں اُٹھ رہی ہیں مگر برف پینے کی طرف طبیعت مائل نہیں۔ پھر ہوٹل کی کرسی گھیرنے کا جواز کیا ہو۔ مجبوراً کوکا کولا ہی منگایا پھر کمال بے دلی کے ساتھ اس کی چسکیاں لینے لگے۔

لیجئے اسی وقت یہ بھی یاد آیا کہ آج تو فلاں صاحب کے یہاں چائے کی دعوت تھی۔ رات انھوں نے کہا تھا کہ علی الصباح وہ گاڑی لے کر آئیں گے۔ غالباً فورٹ کی طرف کہیں رہتے ہیں نام یاد نہیں۔ یاد کیسے رہتا۔ ملاقات کل پہلی ہی بار ہوئی تھی اپنے بیان کے مطابق وہ تجلی کے بہت پرانے شیدائیوں میں سے ہیں۔ کل شام چائے کے ساتھ انھوں نے اتنا کھلا دیا تھا کہ رات کا کھانا بغیر بھوک ہی کے کھایا۔ کھانا اس لئے پڑا کہ کھلانے والے صاحب نے بڑے شوق اور اہتمام سے وسیع و عریض دسترخوان بچھایا تھا۔

خدا خدا کر کے دفاتر کھلے۔ مولانا منیری نے فوراً ہی متعلقہ افراد سے ہمارے پاسپورٹ کے بارے میں استفسار کیا ـــ جواب کل سے مختلف نہیں ملا ـــ وہی ڈھاک کے تین پات ـــ "پاسپورٹ نہیں ملا ـــ!"

اب مولانا منیری نے ہم سے دریافت کیا کہ آیا آپ کے پاس اپنے کچھ فوٹو ہیں؟ ـ ہم نے جواب دیا کہ فوٹو تو نہیں البتہ وہ نگیٹیو موجود ہے جس کی چھاپی ہوئی کاپیاں درخواست کے ساتھ بھیجی گئی تھیں۔ وہ کہنے لگے کہ پھر تو آپ فوراً فلاں فوٹو گرافر کی دکان پر جائیے اور میرا حوالہ دے کر کہیئے کہ جلد سے جلد چار پانچ کاپیاں چھاپ دے۔ ہم نے کہا بہت بہتر۔ لیکن فوراً ہی مولانا نے فرمایا کہ ذرا ٹھیریئے میں خود آپ کے ساتھ چلتا ہوں پھر وہ ہمیں لیکر مسافر خانے سے باہر نکلے اور ٹیکسی پکڑی۔ کچھ دیر بعد ہم ایک فوٹو اسٹڈیو میں تھے جہاں سے ہم نے اپنے نگیٹیو کے کئی پرنٹس پندرہ بیس ہی منٹ میں حاصل کر لئے۔

یہاں یہ وضاحت نہ کرنا ناشکری کے مرادف ہوگا کہ مولانا منیری نے ہماری خاطر یہی نہیں کہ صرف اپنا قیمتی وقت ہی خرچ کیا بلکہ ٹیکسی کا کرایہ بھی ہمیں نہیں دینے دیا۔ یہ بظاہر ایک معمولی سی بات ہے لیکن اس سے مولانا کے ظرفِ عالی اور جذبۂ خدمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تصویر کی کاپیوں کے انتظار میں پندرہ بیس منٹ کا جو عرصہ گذرا اس میں ہمارے مابین ملکی و ملّی مسائل پر گفتگو ہوئی۔ یہ گفتگو اگرچہ مختصر تھی اور اپنی موجودہ ذہنی حالت میں ہم اس کے پوری طرح اہل بھی نہ تھے لیکن بہرحال اس گفتگو سے معلوم ہو گیا کہ مولانا کا جذبۂ خدمت صرف حجاج تک ہی محدود نہیں بلکہ وہ پوری ملّتِ مسلمہ کی خدمت کا بھی قوی جذبہ رکھتے ہیں۔ مسلمانوں کے رنجیدہ حالات پر انھیں بڑی تشویش تھی اور مسلمانوں کے قائدین و ائمہ میں جو افتراق و نزاع ہے اس کے لئے وہ بے حد فکرمند تھے۔ انھوں نے ہمارے اس خیال پر صاد کیا کہ بنیادی چیز افرادِ ملت کا اتحاد و اشتراک ہی ہے۔ اور یہ نعمت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہمارے عمائدین ہی اتحاد و اشتراک کی راہ نہ چلیں۔

فوٹو اسٹڈیو سے باہر آکر مولانا نے فرمایا کہ آپ بے فکری سے جہاں چاہے تشریف لے جائیں۔ ظہر کے وقت تک انشاء اللہ نیا پاسپورٹ تیار ہو جائے گا پھر آپ چاہے مسافر خانے آکر اسے وصول کر لیں یا مجھ پر چھوڑ دیں کہ میں شام تک آپ کو پہنچا دوں گا۔

ہم نے کہا آپ کی نوازشوں کا بہت بہت شکریہ ہم

خود ہی حاضر ہو کر پاسپورٹ لے لیں گے۔ آپ اسے بس تیار فوراً کرا دیں۔

اُس وقت شاید دن کے دس بجے ہوں گے۔ ظہر کا وقت کچھ زیادہ دُور نہیں تھا۔ بہت سے بہت پانچ چھ گھنٹے۔ جی چاہا کہ کسی دو منزلہ بس کی اُوپر والی منزل میں بیٹھ جائیں اور کنڈیکٹر سے کہیں کہ جہاں تک بھی یہ جاتی ہو وہیں تک کا ٹکٹ دیدو۔ پھر جب وہ اپنے آخری اسٹیشن پر پہنچے تو دوسرے راؤنڈ کا ٹکٹ خرید لیں۔ اسی طرح یہ پہاڑ جیسے گھنٹے کٹ جائیں۔ دل اب بھی مطمئن نہیں تھا کہ پاسپورٹ مل ہی جائے گا۔ وسوسے برابر کچوکے لگا رہے تھے۔ سر بوجھل تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ خیال آتا ہے کہ شاید پندرہ منٹ سے بھی زیادہ ہم ایک فٹ پاتھ پر اس اُدھیڑ بن میں کھڑے رہے کہ اب کدھر جائیں۔ کونسا مشغلہ ہو جس میں منہمک ہو کر غیر مختتم وسواس کی جراحت کاریوں سے نجات پا سکیں۔ بسیں برابر آ جا رہی تھیں۔ ٹیکسیاں بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد نظر آتیں۔ ہنگامے شباب پر تھے۔ عین اسی وقت ایک ٹیکسی برابر میں آ کر رُکی۔ اس سے کچھ سواریاں اُتریں اور پھر ڈرائیور نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ ہم تذبذب کے عالم میں تو تھے ہی۔ نیم شعوری کی سی کیفیت میں ٹیکسی کی طرف بڑھ گئے۔

"کہاں؟" ڈرائیور نے سوال کیا۔ ہم نے پچھلی سیٹ کی پشتگاہ سے ٹیک لگاتے ہوئے سوچا کیا جواب دیں۔ منزل تو کوئی ہے ہی نہیں۔ دادر، پریل، فورٹ، چوپاٹی ہینگنگ گارڈن ـــــ اس طرح کے چند نام نہ جانے کب کے حافظے کی تختی پر مدھم سی لکیروں کی شکل میں پڑے تھے۔ ان میں سے کس کو نوک زباں پر لائیں۔ کہاں کا رُخ کریں۔ ڈرائیور نے انجن کھول دیا تھا۔

"بتائیے جناب کدھر چلنا ہے ـــ" اس نے پہلے سے بلند آواز میں پوچھا۔ ہو سکتا ہے اس نے سمجھا ہو مولوی صاحب اونچا سنتے ہیں۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا سکھ تھا۔

"چوپاٹی چلو ـــــ" ہماری زبان سے بس یونہی نکلا۔ گاڑی حرکت میں آ گئی۔ ہمیں اندازہ نہیں کتنے وقت میں اس نے ہمیں چوپاٹی پہنچا دیا ہوگا۔ پھر وہ انتظار میں رہا ہوگا کہ اب مولوی صاحب ٹیکسی سے نکل کر کرایہ ادا کریں گے، لیکن ہم نہیں اُترے۔ دھوپ ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔ موسم اب ایسا نہیں تھا کہ دھوپ میں پھرنا خوشگوار محسوس ہوتا۔ ہم نے دُور تک نظر دوڑائی۔ میرین ڈرائیو کی سر بفلک عمارتیں ایک دلکش گھوم کے ساتھ دُور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے دامن میں رینگنے والی سُرمئی سڑک پر ٹریفک کا منظر خاصا جاذبِ توجہ نظر آ رہا تھا۔

"چلو میرین ڈرائیو کا ایک راؤنڈ لے کر پھر اسی طرف لوٹ آؤ۔" ہم نے سمندر کی سُرمئی پہنائی پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ ٹیکسی فوراً متحرک ہو گئی۔

وقت چیونٹی کی رفتار سے رینگ رہا تھا۔ گھڑی ہماری کلائی پر ضرور تھی لیکن اسے دیکھتے ہوئے ہمیں خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ یہی تو بتائے گی کہ ابھی فقط نصف گھنٹہ گذرا ہے۔ ابھی ظہر کے وقت میں اتنی دیر ہے کہ زمین کو نہ جانے کتنے ہزار میل گردش کرنی ہوگی۔ سورج کو نہ جانے کتنی دُور چلنا پڑے گا۔ سمندر کی سبک خرام موجیں ساحل کی ریت پر آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ ٹیکسی تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

"ذرا آہستہ ـــــ ڈرائیور صاحب سفر کے انداز میں نہیں سیر کے انداز میں چلیئے۔" ہم نے آرڈر کے انداز میں نہیں بلکہ گذارش کے لہجے میں کہا۔

"جیسی مرضی جناب۔" ڈرائیور نے شائستہ لہجے میں جواب دیا۔ پھر ٹیکسی چلنے کے بجائے رینگنے لگی۔

یہ بے مدعا سیر ہم نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک کی تھی۔ نہ جانے کہاں کہاں پھرے۔ ڈرائیور معاملہ فہم معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کہیں بھی تو کوئی ایسا لفظ نہیں کہا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ وہ ہمارے خللِ دماغی سے پریشان ہے یہ ظاہر ہے کہ وہ ہمیں کریک تصور کر رہا ہوگا لیکن ہمارا

کریک ہونا اس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ اسے تو اپنا کرایہ چاہیئے تھا اور وہ اسے حسب دلخواہ ملا۔ یاد پڑتا ہے کہ پائے دھونی کے قریب اُتارتے ہوئے اس نے ہم سے بائیس روپے کچھ پیسے وصول کئے تھے۔ ہم نے یہ نہیں پوچھا کہ کس حساب سے۔ پوچھ کر کرتے بھی کیا۔ سوار ہوتے وقت میٹر دیکھنے کا ہمیں خیال ہی نہیں آیا تھا۔ ہوسکتا ہے اس نے قاعدے سے کچھ زیادہ ہی وصول کر لئے ہوں مگر شرافت کا تقاضا یقیناً یہ ہے کہ ہم بدگمانی سے کام نہ لیں۔ وہ اگر پچاس روپے بھی کہتا تو ہم دیتے اور واقعہ یہ ہے کہ جس مالیخولیائی کیفیت میں ہم مبتلا تھے اس میں پیسہ کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ خوشی کی بات تو یہ تھی کہ ڈیڑھ گھنٹہ کٹ گیا تھا

یہ تذکرہ ابھی تک ہم نہیں کر سکے کہ ضابطے کی اقامت گاہ تو ہم نے کیو پریس ہی کو قرار دے رکھا تھا لیکن عملاً ہماری رہائش جماعت اسلامی کے اس دفتر میں تھی جو ابراہیم رحمت اللہ روڈ پر واقع ہے۔ ٹیکسی سے ہم ٹھیک دفتر ہی کے سامنے اُترتے لیکن پائے دھونی کے فٹ پاتھ پر ہمیں وہی کرم نظر آ گئے تھے جنھوں نے آج صبح کے لئے چائے کی دعوت دی تھی۔ یہاں سے دفتر کا فاصلہ نصف فرلانگ سے زیادہ نہ رہا ہوگا۔ ہم ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے فارغ ہی ہوئے تھے کہ وہ سڑک پار کر کے ہم تک آ پہنچے۔

"کیا بات ہے مولانا ــــ کیسا مزاج ہے؟" ــ انھوں نے ہمیں اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے تشویشناک سے لہجے میں پوچھا۔

"الحمد للہ ٹھیک ہوں ــــ آپ کہئے یہاں کیسے کھڑے ہیں؟ ــ"

"کچھ نہیں بس یونہی ــــ ذرا ایک صاحب کا انتظار ہے۔ صبح تو ہم حاضر ہوئے تھے۔ دفتر بند تھا۔ کافی دیر کھڑے رہے ــــ کیا آپ رات کہیں اور سوئے تھے؟"

"جی نہیں۔ سویا تو یہیں تھا مگر یاد ہی نہ رہا کہ چائے آپ کے ساتھ پینی ہے۔ صبح ہی صبح کسی اور طرف نکل گیا۔ شرمندہ ہوں کہ آپ بھی کیا کہتے ہوں گے ــ"

"کوئی مضائقہ نہیں۔ ایسا تو ہو ہی جاتا ہے۔ یہ بتلائیے اس وقت تو کوئی مصروفیت نہیں؟"

"جی نہیں۔ فارغ ہی فارغ ہوں۔"

"بس تو کھانا اس وقت ہمارے ہی ساتھ کھائیے صبح کی تلافی ہو جائے گی۔"

"یہی سہی۔ ویسے چائے کی تلافی کے لئے تو بس چائے ہی کافی ہوتی۔"

"چلئے چائے بھی کسی ہوٹل میں پئے لیتے ہیں۔ کھانا تو کھا ہی لیں گے۔"

"یہ مطلب نہیں ــــ کھانا کھانا اگر ضروری ہے تو اس وقت چائے کے کوئی معنی نہیں۔"

پھر چند منٹ بعد گلی سے وہ صاحب برآمد ہوئے جن کا ہمارے کرم فرما کو انتظار تھا۔ اب ٹیکسی پھر ہمیں بھری پُری سڑکوں پر اُڑائے لئے جا رہی تھی۔

چھوٹی چھوٹی تفصیلات میں جائیے تو یہ روداد ایک ضخیم کتاب بن سکتی ہے۔ مگر مقصود کتاب لکھنا نہیں۔ نہ یہ مطلوب ہے کہ آپ فضول و بے کیف جزئیات سے اُکتا کر ورق اُلٹ دیں لہٰذا ہماری اور آپ کی سلامتی اسی میں ہے کہ اب جلدی سے یہ رام کہانی ختم ہو۔

ظہر کے بعد مسافر خانے پہنچے تو مولانا منیری نے جہاں یہ فرمایا کہ نیا پاسپورٹ غالباً تیار ہو گیا ہوگا۔ وہاں یہ بھی بتایا کہ سعودی سفارت خانے کے ویزا آفیسر کا آدمی آپکو تلاش کر رہا ہے۔

"کیوں کر رہا ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"خدا جانے ــــ آپ اُوپر جا کر مل آئیے ــــ"

"نہیں ــ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ آپ پہلے ہمارا پاسپورٹ دلوائیے ــ"

مولانا اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر چند ہی ثانیے بعد ہم اور وہ اسی دفتر میں موجود تھے جہاں سے کل ہمیں مایوس و نامراد لوٹنا پڑا تھا۔ وہی گھما گھمی۔ وہی ہلچل۔ مولانا آگے بڑھ کر

ہمارے پاسپورٹ کے بارے میں سوال کیا۔ مسئول نے نہ جانے کیا جواب دیا۔ ہم فاصلے اور شور کی وجہ سے سن نہیں سکے۔ دل کی رفتار تو اس کمرے میں قدم رکھتے ہی تیز ہوگئی تھی۔ سماعت ٹھٹھر گئی ہو تو تعجب نہیں مگر الحمد للہ اس وقت چند ثانیے سے زیادہ بیم و رجا کی کشمکش کا عذاب نہیں سہنا پڑا۔ کانوں میں یہ شہد بھرے الفاظ ٹپک ہی گئے کہ لیجئے نیا پاسپورٹ تیار ہے۔

اور ٹھیک اسی وقت ـــــ جی ہاں عین اس وقت جب نیا پاسپورٹ ہماری طرف بڑھایا جا رہا تھا کمرے ہی کے کسی گوشے سے یہ نعرہ بلند ہوا کہ پہلا پاسپورٹ تو یہ موجود ہے!ـــ

"کیا کہا ـــ موجود ہے!؟" ہم نے حیرت زدہ ہو کر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ بعض اور زبانوں پر بھی اسی طرح کا سوال تھا۔ پھر سوال و جواب کی آوازیں کچھ ایسی گڈمڈ ہوئیں کہ ایک ذہنی جھٹکے کے سوا ہمارے پلے کچھ بھی نہیں پڑا۔ یہ لمحات بڑے ڈرامائی تھے۔ کیا طلسم ہوشربا تھا کہ جو پاسپورٹ کئی کئی بار تلاش کے باوجود ہاتھ نہیں آیا وہ عین اس وقت اچانک نمودار ہوگیا۔ جب نیا پاسپورٹ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ ہماری ذہنی حالت اگر نارمل ہوتی تو ان ڈرامائی لمحوں کی ساری ڈرامائیت ادنیٰ سے ادنیٰ تفصیل کے ساتھ حافظے کے دامن میں سمیٹ لاتے۔ مگر ہم پر تو کیفیت ہی کچھ ایسی طاری تھی کہ اس وقت جو کچھ دیکھا اور جو کچھ سنا وہ حافظے کی لوح پر واضح تحریر کی شکل میں ثبت نہیں ہو سکا، بلکہ بس ایک مجموعی تاثر ایسا چھوڑ گیا جیسے بھیگی ہوا کا جھونکا ہلکی سی نمی چھوڑ کر گذر جائے۔ یہ تک یاد نہیں کہ ہمیں جو پاسپورٹ عنایت کیا گیا وہ وہ تھا جو بعد میں تیار کیا گیا یا وہ تھا جو ہمیں حال سے بے حال کرنے کے لئے کسی بھوت کی طرح غائب ہوگیا تھا اور پھر جلوہ طراز اس وقت ہوا جب اس کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

یہ معمہ بڑے سے بڑا اطباع بھی قیاس و اجتہاد کے ذریعہ حل نہیں کر سکتا کہ پاسپورٹ آخر غائب کہاں اور کیوں ہوگیا تھا۔ مگر حل اس معمے کا بہت سادہ ہے جسے دو لفظوں میں یوں سمجھئے کہ جس روز یہ تیار ہوا تھا اسی روز ایک عزیز مکرم اسے اپنے گھر لئے چلے گئے تھے۔ ان عزیز کا نام ٹھیک طور پر یاد نہیں۔ خیال آتا ہے کہ شاید عبد القدیر یا کچھ ایسا ہی سا نام تھا۔ یہ حج کمیٹی کے متعلقہ دفاتر ہی میں کام کرتے ہیں ان کے والد محترم تجلی کے قارئین میں سے ہیں۔ انھوں نے جب تجلی میں پڑھا کہ ایڈیٹر تجلی بھی امسال حج کو جا رہا ہے تو انھیں اشتیاق پیدا ہوا کہ اس سے ملاقات کریں۔ اس اشتیاق کو پورا کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا تھا کہ وہ اچانک بیمار ہوگئے۔ بیماری کسی قسم کے شدید درد پر مشتمل تھی اور رہائش ایک مکان کی بالائی منزل میں رکھتے تھے۔ جب انھیں اندازہ ہوا کہ ملاقات کی خاطر وہ مسافر خانے یا کیو پریس نہیں جا سکیں گے تو انھوں نے اپنے صاحب زادے سے خواہش ظاہر کی کہ کم سے کم عامر عثمانی کا فوٹو تو دکھلا ہی دو جو پاسپورٹ بننے کے سلسلے میں یقیناً آیا ہوگا۔ صاحب زادے نے حکم کی تعمیل کی اور خوب کی۔ فوٹو پاسپورٹ سے منسلک تھا۔ وہ پاسپورٹ ہی اُٹھا کر لے گئے۔ والد صاحب کو دکھلا کر فوراً واپس لے آتے تو کوئی قضیہ کھڑا نہ ہوتا۔ لیکن جب کاتب تقدیر ہی نے ہمارے حصے میں شدید ذہنی ابتلا اور روحانی کرب کی کچھ گھڑیاں لکھ دی تھیں تو کیسے یہ قضیہ کھڑا نہ ہوتا یہ تفصیل ہم نہیں بتا سکتے کہ دفتر میں جو ڈیڑھ دن تک پاسپورٹ کی گم شدگی کا ہنگامہ رہا اس کی بھنک عزیز موصوف کے کانوں تک کیوں نہ پہنچی۔ اگر پہنچ جاتی تو یقیناً وہ بتا دیتے کہ صورت حال حقیقت میں کیا ہے۔ یہ بہر کیف ہمیں یاد ہے کہ بعد میں انھوں نے شرمندگی کا اظہار کیا تھا اور ہمیں بڑے اصرار کے ساتھ اپنے گھر بھی لے گئے تھے۔

یہاں ان کے والد محترم سے ملاقات ہوئی۔ یہ واقعی صاحب فراش تھے۔ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ بہت سی باتیں کیں۔ خاطر مدارات فرمائی۔ امید ہے کہ وہ اب

صحت مند ہو چکے ہوں گے۔

تو یہ تھی وہ دلچسپ افتاد جس کے نتیجے میں ہمارا اندازہ یہ ہے کہ زیادہ نہیں تو پانچ تولہ خون ضرور خشک ہوا ہوگا! اب وہ واقعہ بھی سنیئے جس کے نتیجے میں ہم نے یہ اندازہ کیا کہ خشک شدہ خون فوراً بن گیا ہوگا۔

پاسپورٹ ہاتھ میں آگیا تو معاً ایسا محسوس ہوا جیسے چاروں طرف بے شمار قمقمے جل اٹھے ہوں۔ جیسے تاریکیوں کے دبیز پردے آنکھوں کے سامنے سے ہٹتے چلے گئے ہوں۔ بمبئی وہی تھی۔ مناظر وہی تھے۔ مگر ہر چیز ایسی شاداب اور نکھری ہوئی نظر آرہی تھی جیسے اسے ابھی ابھی غسل دیا گیا ہو۔ حجاج کے شور و غل میں ایک موسیقی تھی۔ جو دھکے پاسپورٹ ملنے کے بعد ہم نے مسافر خانے کی راہداریوں کی بھیڑ میں کھائے وہ اتنے خوشگوار تھے جیسے ہماری پیٹھ پر شاباشی کی تھپکیاں دی جا رہی ہوں۔ چائے ــ حالانکہ وہی پاؤڈر والی تھی مگر اسوقت اس نے ایسی لذت دی جیسے اعلیٰ درجے کا دودھ پی رہے ہوں۔ کوکا کولا اتنا خوش ذائقہ لگا جیسے پچاس پیسے میں وہ بالکل مفت ہو۔ در و بام جو کچھ دیر قبل تک اداسیوں اور مایوسیوں کی گرد میں اٹے ہوئے تھے اب صاف شفاف دل کش اور حسین نظر آرہے تھے۔ دو شعر اس وقت بے ساختہ یاد آئے جنھیں نہ جانے کتنی بار ہم نے گنگنایا:۔

اگر شریکِ جمالِ رنگیں ہمارا حسنِ نظر نہ ہوتا
قمر میں نورِ قمر نہ ہوتا سحر میں رنگِ سحر نہ ہوتا

یہ تو اپنا ہی تھا۔ دوسرا شاید فنا بدایونی کا ہے:۔

بے ذوقِ نظر حسنِ تماشا بھی نہیں ہے
منھ پھیر لیا ہم نے تو دنیا بھی نہیں ہے

یاد تو ایک اور بھی شعر آیا تھا:۔

جب جیب میں پیسے بجتے ہیں جب پیٹ میں روٹی ہوتی ہے
اس وقت یہ پتھر ہیرا ہے اس وقت یہ قطرہ موتی ہے

لیکن اسے گنگنایا اس لئے نہیں کہ ہماری کہانی کا سرا کمیونزم کی جدلیاتی مادیت سے نہیں مل رہا تھا۔ ہماری جیب میں پیسے بھی تھے اور پیٹ میں روٹی بھی۔

خوب یاد ہے کہ پاسپورٹ وصول کر کے جب مولانا منیری کے ہمراہ بالائی منزلوں سے نیچے اترے تھے تو سیڑھیوں کا باہمی فاصلہ ہمیں اتنا کم محسوس ہوا تھا جیسے وہ گڑیوں کے لئے بنائی گئی ہوں۔ دل چاہ رہا تھا کہ ہر اگلا قدم آٹھویں دسویں سیڑھی پر جا کر پڑے۔ جسم ایسی بے وزنی کی کیفیت محسوس کر رہا تھا جسکی کہانی خلائی مسافروں کے سلسلے میں سنی جا رہی ہے۔

نہ جانے کتنی ساعتیں اسی عالمِ رنگ و طلعت میں گذارنے کے بعد آخر کار ہم نے مولانا منیری سے کہا کہ اب ہمیں بتلایئے کون ہمیں تلاش کر رہا تھا اور کہاں ہماری طلبی ہے؟

مولانا نے اس وقت بھی اسی گرمجوشانہ رہنمائی کا مظاہرہ فرمایا جس سے اب تک نوازتے رہے تھے۔ فوراً اٹھے اور دالانوں سے گذار کر زینوں کی طرف لے چلے۔ یاد نہیں کتنی سیڑھیاں چڑھ کر ہم مسافر خانے ہی کے ایک بالائی کمرے میں پہنچ گئے تھے۔ یہاں سعودی ویزا آفیسر کے غالباً سکریٹری صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہمیں بیٹھنے کو کہا اور اب مولانا منیری یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ یہی صاحب آپکو وہاں پہنچا دیں گے جہاں آپ کو یاد کیا جا رہا ہے۔

کچھ دیر بعد ہمیں ایک بڑے کمرے میں پہنچایا گیا جہاں ایک خوش پوش عرب افسر لمبی سی میز کی پشت پر تشریف فرما تھے۔ صحت مند چہرہ۔ وجیہہ و مؤثر شخصیت۔ کافی تپاک سے ہمارا مصافحہ ہوا۔ پھر انھوں نے ایسی باتیں کہیں جن سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کے قلب میں ایک خادمِ دین و ملت کی حیثیت سے ہمارا کافی احترام موجود ہے۔ وہ عربی بول رہے تھے۔ مگر ہم انھیں عربی میں جواب نہیں دے سکے کہنے کو ٹوٹے پھوٹے فقرے ہم نے کہے ضرور تھے مگر ان کا حاصل فقط اعتذار تھا۔ ہم نے کتابی عربی میں انھیں یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ عربی بولنا ہمارے بس کا روگ نہیں۔ جو کچھ آپنے فرمایا اسے مر مار کے ہم نے سمجھ تو لیا اور اس کے لئے آپ کے شکر گذار بھی ہیں لیکن روانی کے ساتھ عربی میں جواب بھی دے سکیں یہ ہماری مقدرت سے باہر ہے۔

اس اعتذار پر انھوں نے اخلاق آمیز تبسم کے ساتھ ہماری ہمت افزائی یہ کہہ کر فرمائی کہ بے شک ہم آپکی معذوری کو سمجھتے ہیں۔ آپ اُردو ہی میں گفتگو کیجئے۔ یہ ترجمانی کے فرائض انجام دیں گے۔

ان کا اشارہ سکریٹری صاحب کی طرف تھا جو ملاقات کی تمام مدت تک یہیں موجود رہے۔

ندامت ہمیں جیسی کچھ ہو رہی تھی اُسے آپ سے کیا چھپائیں۔ منصب تو یہ کہ رسالے میں جہان بھر کے مسئلے بیان فرماتے ہیں نام کے آگے فاضل دیوبند لکھتے ہیں مولانا اور حضرت کہلاتے ہیں۔ علم و فضیلت کی ایک لمبی سی سند بھی صندوق میں محفوظ رکھ چھوڑی ہے، لیکن نااہلی کا عالم یہ کہ پانچ منٹ عربی میں بات بھی نہیں کر سکتے ہکلا ہکلا کر فقرہ پورا کرتے ہیں اور اس فقرے میں بھی نہ جانے کہاں کہاں جھول ہو۔ کیسی کیسی غلطیاں ہوں۔

واقعہ اگرچہ یہ ہے کہ ایک طرف تو جدید عربی میں اسالیب کافی بدل گئے ہیں، دوسری طرف الفاظ اور مشتقات نئے نئے ہیں، تیسری طرف کتنے ہی جملوں کو مخفف کر لیا گیا ہے جن کی حیثیت خالص محاورات کی بن گئی ہے، چوتھی طرف۔ جو سب سے بڑی دشواری ہے وہ اہلِ عرب کا لب و لہجہ اور رفتار کلام ہے الفاظ اپنی اصلی شکل میں اگر ہندوستانی سامع کے دماغ میں پہنچیں ہی نہیں تو ان کا مفہوم و منشاء کیونکر اخذ کیا جا سکے گا۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ بڑے سے بڑا عربی داں بھی حجاز کے ایک معمولی آدمی سے پانچ منٹ گفتگو نہیں کر سکتا اگر پہلے سے اس کی مشق بہم نہ پہنچائی ہو۔ وہاں کے اہلِ علم کی بولی اگرچہ وہاں کے عوام کی بہ نسبت خاصی حد تک قابلِ فہم ہے لیکن اس میں بھی کثرت سے ایسے ٹکڑے شامل ہوتے ہیں جن کو قدیم عربی کا بڑے سے بڑا اسکالر بھی کم سے کم فوری طور پر تو ذہن کی گرفت میں نہیں لے سکتا الّا یہ کہ وہ کچھ دنوں ان لوگوں میں رہا ہو یا کسی رہنے والے کا تربیت یافتہ ہو۔ علاوہ ازیں رفتار کلام ان کی بھی خاصی تیز ہوتی ہے۔ طرزِ ادا بھی وہ نہیں جو مخاطب کو غور کرنے کی تھوڑی سی مہلت دے سکے۔ اگر سفیر حج کا کوئی ٹکڑا اچھا کبھی نذرِ قرطاس کرنے کی نوبت آئی تو ہم چند دلچسپ مثالوں سے اس صورتِ حال کو واضح کرنے کی سعی کریں گے۔

فی الحال تو یہ سمجھ لیجئے کہ اپنی معذوری کا منطقی جواز رکھتے ہوئے بھی ہمیں بڑی شرمندگی ہو رہی تھی کہ جس مدیر تجلّی کو وہ چشم بددور عالم فاضل اور نہ جانے کیا کیا سمجھ رہے ہیں وہ اتنا جاہل واقع ہوا ہے کہ اسلام کی سرکاری زبان میں کچھ دیر ان سے بات بھی نہیں کر سکتا۔

گفتگو ترجمانی ہی کے توسط سے ہوئی۔ مگر گفتگو کے باقی مراحل میں انھوں نے انگریزی سے کام لیا اور ترجمانِ محترم سلیس اُردو میں ہمیں اس کا ترجمہ سنا کر ہمارے جواب کو انگریزی میں منتقل کرتے رہے۔ ایسا شاید اس لئے کیا گیا کہ ترجمانِ محترم کے لئے عربی کے عوض انگریزی سمجھنا اور بولنا آسان رہا ہوگا۔

اسی دوران میں افسر صاحب نے ہمیں دو ورق عنایت کئے جن کی پیشانیوں پر "وزارۃ الخارجیۃ السفارۃ العربیۃ السعودیۃ بالھند" چھپا ہوا تھا اور پہلو میں ہمارے فوٹو کی ایک ایک کاپی چپکی ہوئی تھی۔ نیچے اسی سفارت خانے کی مہریں تھیں۔ ایک کاغذ ان میں اس مضمون کا تھا کہ یہ مدیر تجلّی السید عامر عثمانی ہیں (اب دیکھ لیجئے کہ محاورے کی کرامت سے عامر عثمانی کو سید کہلانے کا بھی فخر (؟) حاصل ہو گیا) یہ ۱۳۸۷ھ کا فریضۂ حج ادا کرنے جا رہے ہیں۔ انھیں وہ تمام ٹیکس اور محاصل معاف کئے جاتے ہیں جو مملکتِ عربیہ سعودیہ میں دورانِ حج میں حجاج کو ادا کرنے پڑتے ہیں یہ سرٹیفکٹ اس لئے دیا گیا ہے تاکہ ان کے خیر مقدم میں اس خصوصی رعایت کا لحاظ رکھا جائے۔

دوسرے ورق کا خلاصہ یہ تھا کہ اپنی خاص حیثیت میں مدیر تجلّی بجا طور پر اس کے مستحق ہیں کہ ضابطہ و قانون کی رو سے حاجیوں پر زمانۂ حج میں جو پابندیاں نقل مکانی کے سلسلے میں عائد ہوتی ہیں ان سے انھیں مستثنیٰ رکھا جائے۔ یہ جب جہاں چاہیں بغیر روک ٹوک کے جا سکیں۔

ان اوراق کے لئے جذبۂ امتنان کا اظہار کرنے کے بعد ہم نے رخصت کی اجازت طلب کی تو بڑے اخلاق سے

جواب ملا کہ ایک منٹ ٹھیریئے کوکا کولا آرہا ہے۔ پھر جب تک کوکا کولا آیا تھوڑی سی اور باتیں ہوگئیں۔ نچوڑ ان باتوں کا یہ تھا کہ افسر موصوف دین و ملت کے مسائل سے اپنے ذہنی تعلق اور علمائے دین کے لئے گہرے جذباتِ عقیدت کا اظہار فرما رہے تھے اور ہم ان کے خیالات و محسوسات کو سراہنے کی ایک رسمی سی خدمت انجام دیئے جا رہے تھے۔

آخر کار ان کی ضیافت سے لطف اندوز ہونے کے بعد ایک گرمجوش مصافحہ نے اس ملاقات کا اختتام کیا رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے وہ اخلاقاً کھڑے بھی ہوگئے تھے اور ہمیں حقیقتہً خوشی بھی سب سے زیادہ اسی بات کی ہوئی کہ جو مراعاتِ خصوصی ہمیں عطا کی گئیں ان کے عطا کرنے کا انداز ایسا نہیں تھا جیسے کوئی بڑا آدمی کسی چھوٹے آدمی پر بارانِ کرم کرے بلکہ افسر موصوف کا مجموعی طرزِ عمل اس بات کا مظہر تھا کہ عطا کے پیچھے عقیدت و احترام کا جذبہ کارفرما ہے۔ ادب و شائستگی ہے۔ شرافت و نجابت ہے۔ دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ ظاہراً موصوف کا رویہ اس شخص کی مانند رہا جو اپنے کسی ممدوح کی خدمت میں عقیدت و نیاز مندی سے کوئی نذر پیش کر رہا ہو۔

پھر بتلایئے۔ اس واقعے کا طبعی اثر کیا یہ نہیں ہونا چاہیئے تھا کہ جتنا خون خشک ہوا ہے اس سے زیادہ ہی پیدا ہو جائے اور ہم اس خوشگوار یقین کی بہجت ریز فضا میں گم ہو جائیں کہ ہمارا رحیم و کریم پروردگار جن غیر معمولی نعمتوں اور نوازشوں سے ہمیں ہمیشہ نواز تا رہا ہے اس سفر میں بھی ان کا زریں سلسلہ انشاء اللہ قائم رہے گا۔

ٹیکسوں کی معافی تو خیر اپنی ذاتی حیثیت میں بہت زیادہ اہم نہیں لیکن آزادی سفر کی نعمت ہم جیسے آزاد منش آدمی کے لئے ایک ایسی نعمت تھی کہ ہزار شاہی دعوتیں اس پر قربان۔ جب دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تھے تو پہلے ہی دن یہ طے کر لیا تھا کہ کسب معاش کے سلسلے میں چاہے پنواڑی کی دکان کھولنی پڑے لیکن ملازمت نہیں کریں گے

ملازمت پابندی کا دوسرا نام ہے اور پابندی ہمارے لئے دنیا کا سب سے بڑا عذاب ہے۔ اپنی مرضی اور شوق سے ہم دس گھنٹے ایک جگہ جم کر کام کر سکتے ہیں لیکن قید لگا دیجئے کہ دو گھنٹے بیٹھنا ہوگا تو یہ دو گھنٹے ہمارے لئے بلائے جان ثابت ہوں گے اور ان میں جو کام ہم کر سکیں گے وہ ایسا نہیں ہوگا جس پر اعتماد کیا جا سکے۔

اب آپ اعتراض کریں گے کہ جب تم آسائشوں اور آسانیوں کو خدا کے انعام و اکرام کا نام دے رہے ہو تو پھر کیوں اس وہم میں مبتلا ہو کہ تمہارا حج، حقیقی حج نہیں ہوا۔ یہ تو حج کی توہین ہے کہ حج کرو اور اسے حج کی نقل کہو۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ حج کیا ہی نہ ہو۔ بس ایسے ہی ٹہل وہل کے چلے آئے ہو۔

آپ کا اعتراض اور اشتباہ ہیں تو دونوں کچھ جاندار ہے۔ مگر اب اتنا بھی سیاہ کار اور گیا گذرا مت سمجھیئے کہ حجاز پہنچ جائیں اور ٹوٹا پھوٹا سا حج بھی نہ کریں۔ حج اس کے تمام فقہی لوازمات سمیت ادا کیا تھا۔ عمرے بھی کچھ نہ کچھ ہو ہی گئے۔ قابلِ ذکر مقامات میں سے بھی اکثر پر جانے کی سعادت سے محروم نہیں رہے۔ یہاں تک کہ جبلِ نور کی اوسطاً ایک گھنٹہ کی چڑھائی چڑھ کر غارِ حرا کا دیدار بھی ان گناہگار آنکھوں کو میسر آ ہی گیا۔ لیکن کسی بھی مرحلے میں ایسی کوئی خاص بات پیش نہیں آئی جسے عجز و انکساری کے ڈھلے ڈھلائے انداز میں بیان کر کے ہم آپ پر اپنی روحانیت اور للّٰہیت کا سکہ جما سکیں۔ یا جسے پُرسوز و دلگداز الفاظ میں سپردِ قلم کر کے ہم یہ جتلا سکیں کہ اہل اللہ اور اربابِ تقویٰ کو جو معنوی لذتیں اور روحانی نعمتیں حرمین کی بارگاہِ قدس سے نصیب ہوتی ہیں ان کا کوئی حصہ ہمیں بھی میسر آ گیا ـــــ نہیں دوستو۔ ہم وہ تیرہ بخت ہیں کہ جیسے کورے گئے تھے ویسے ہی کورے لوٹ آئے۔ آج اپنے باطن، اپنے دل و دماغ اور اپنے نفس کا جائزہ لیتے ہیں تو وہاں سب کچھ وہی ہے جو جانے سے پہلے تھا۔ نہ جہاد فی سبیل اللہ کے جذبے میں کوئی اضافہ ہوا۔ نہ صوم و صلوٰۃ کے ذوق میں کوئی

ترقی نظر آئی۔ نہ نفس کے تقاضے مضمحل ہوئے۔ نہ دنیا کے ہنگاموں سے طبیعت اُچاٹ ہوئی۔ وہی بے فکری ہے کہ جیسے یوم الحساب تو کبھی آنا ہی نہیں۔ وہی اطمینان ہے کہ جیسے حشر کی ساری ہولناکیاں اوروں ہی کے لئے ہیں۔ خود تنقیدی اگر آدمی کو اس افسوسناک نتیجے تک پہنچائے تو آپ ہی بتائیے وہ کس طرح اس خوش فہمی کی جرأت کر سکتا ہے کہ اس کا حج بارگاہ خداوندی میں مقبول ہو گیا ہو گا ـــــ حج تو بڑی چیز ہے۔ اپنی تن آسانیوں اور غفلت شعاریوں کے پیش نظر ہم تو اسے بھی بہت بڑی بات سمجھیں گے اگر ہاتف غیبی ہمیں یہ مژدہ سنا دے کہ تمہارا فقط ایک سجدہ قبول کر لیا گیا ہے۔ قنوطیت کا مجرم کہیئے یا بے یقینی کا مریض قرار دیجئے۔ ہمیں جتنی بار بھی خانہ کعبہ کی دیوار سے رخسار رگڑنے کا موقع ملا ہم اپنے لئے بس اتنا ہی مانگ سکے کہ اے اللہ اپنے آستانے پر کیا ہوا فقط ایک سجدہ قبول کر لیجئے۔ یوں زبان پر اگرچہ یہ دعا بھی بارہا آئی کہ ہمارا حج قبول فرمایئے لیکن اس دعا کو دعا کہنا ہمارے لئے مشکل ہے کیسے کہیں جبکہ اس کے زبان پر آتے ہی دل کے کسی گوشے سے ندامت کی ایک ہیجان آفریں لہر اُٹھ کر سارے وجود پر چھا جاتی تھی اور پہاڑوں سے ٹکرا کر آنے والی صدائے بازگشت کے انداز میں کوئی چیخ چیخ کر کہتا تھا کہ گستاخ۔ جو کچھ تم مانگ رہے ہو وہ بہت زیادہ ہے۔ اپنا نامۂ اعمال تو دیکھو۔ اپنی بے توفیقیوں پر تو نظر کرو۔ شرم نہیں آتی کہ فقط حج کی نقل کر کے یہ خواہش رکھتے ہو کہ تمہیں بھی ان خوش نصیبوں کے زمرے میں شامل کر لیا جائے جو نوزائیدہ بچوں کی طرح گناہوں سے پاک کر دیئے جاتے ہیں۔

یہ بے لفظ و صوت "آواز" ہمیں کپکپا دیتی تھی۔ ہمارا جسم پسینے میں تر ہو جاتا تھا۔ ہماری زبان لڑکھڑا جاتی تھی اور ایک ایسے آدمی کی طرح جس کی زبان سے وفورِ جوش میں کوئی نہایت ہی نازیبا بات نکل گئی ہو ہم سراپا خوف و ندامت بنکر پکار اُٹھتے تھے کہ نہیں اے ربِ ذی الجلال ہم اس قابل نہیں ہیں۔ ہم اپنی طلب پر شرمسار ہیں۔ ہمیں تجھ سے صرف اتنا ہی مانگنا چاہیئے اور اتنا ہی ہم مانگتے ہیں کہ فقط ایک سجدہ قبول فرمالے ـــ ایک سجدہ ـــ اے رؤف الرحیم صرف ایک سجدہ۔

دعا وہ ہوتی ہے جو اعماقِ قلب سے نکلے۔ جس میں روح کی پکار اور سینے کی ہوک ہو۔ جس کے آہنگ میں بدن کا رواں رواں اپنی لے ملا دے۔ ہم نے خدا کے گھر اور رسولؐ کے شہر میں اپنی ذات کے لئے جتنی بھی دعائیں کی ہیں ان سب میں محض یہی ایک دعا تھی جس کے دعا ہونے پر ہمارا قلب مطمئن ہے۔ جس کے حرف حرف میں ہمارا پورا وجود الحاح و فریاد بن کر سمٹ گیا تھا۔ جسے ہم نے ملتزم، حطیم، مقامِ ابراہیمؑ ہر جگہ دہرایا۔ دہرایا نہیں، بلکہ وہ ہچکی کی طرح آپ سے آپ ہمارے حلق تک آتی رہی۔ آتی رہی اور ہم پتے کی طرح کانپتے رہے۔ ایسی کپکپاہٹ کہ کئی بار ہم نے سمجھا جاڑے بخار کا حملہ ہوا ہے۔ بیت اللہ سامنے تھا۔ اللہ کے نیک بندے طواف اور نوافل کے پاکیزہ مشغلوں میں مصروف تھے اور ہم اپنی ہی فکر میں گم، اپنی ہی ذات کو جہنم کے شعلوں سے بچانے کی خود غرضی میں غرق بیت اللہ کو تکے جا رہے تھے۔ ایک ایسے نادان بچے کی طرح جو چمکیلی چیز کو تحیر اور ندیدے پن سے تکتا ہے۔ ہم سے نہ نمازیں زیادہ پڑھی گئیں۔ نہ طواف بہت سے کئے گئے۔ ایک گم گشتگی کی سی کیفیت تھی اور ہم۔ ایک خواب کا سا عالم تھا اور ہم۔ بار بار زبان یہ دہراتی تھی:۔

اے اللہ! یہ تیرا گھر ہے!

لہجہ اعتراف کا نہیں بلکہ تحیر کا ہوتا تھا لہجے سے مراد آواز کا زیر و بم نہیں ـــ آواز تو کہیں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ سب کچھ بے صوت و آہنگ ہی زبان پر آ رہا تھا۔ ایک عجیب تر بات یہ تھی کہ عظمتِ باری کے احساس سے دل و دماغ اگرچہ بے طرح مبہوت تھے مگر دہشت اور خوف کا دُور دُور پتہ نہ تھا۔ اس کی توجیہہ شاید یہ ہو کہ گناہوں کی کثرت نے دل و دماغ کو اپنے رب کے آگے بے حیا اور ڈھیٹ بنا دیا ہے۔ اللہ کے نیک بندے تو اللہ کے خوف سے تھر تھر کانپتے ہیں مگر ہم فقط حیران و سرگشتہ تھے خوف زدہ نہیں تھے۔ بدن میں کپکپی دہشت کی نہیں بلکہ اُس جذباتی اُتار چڑھاؤ کی تھی جس کا جوار بھاٹا ہمارے کمزور اعصاب کو تانت کی طرح جھنجھنا رہا تھا۔ آدمی اعصاب کا کمزور ہو تو یقین کیجئے وہ بارہا خواب ہائے پریشاں کو کشف اور

وسواس کو الہام سمجھ کر اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ سلوک کی اونچی منزلیں طے ہو رہی ہیں۔ کتنے ہی سادہ لوح صوفی ہیں جو اختلاج کے مریض ہیں مگر وہ گمان کرتے ہیں کہ ان کا دل جاری ہوا ہے۔ خدا بے بنیاد خوش فہمیوں سے بچائے۔ ہم نے اپنے احوال و واردات، اپنے گریہ و شیون، اپنی وارفتگی و دلریشی پر جتنا جتنا غور کیا اتنا ہی اتنا یہ قیاس مضبوط ہوتا گیا کہ یہ اعصاب کی کمزوری اور خون کی کمی کا کرشمہ تھا روحانیت اور سلوک و معرفت سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہی وجہ ہے کہ حج کا سفرنامہ لکھنے پر طبیعت مائل نہیں میلان کے بغیر اگر لکھنا شروع کر دیا تو اول تو وہ ایسا ہی لایعنی اور بے مزا سا ہوگا جیسا کہ یہ اداریہ ہے۔ دوسرے اس میں جذب و شوق اور سوز و گداز کی وہ کیفیت نہ مل سکے گی جس کی توقع ہمارے وہ تمام احباب رکھتے ہیں جنھیں اس سفرنامے کا انتظار ہے۔ تاہم اگر اس عرضِ حقیقت کے باوجود وہ ضروری ہی تصور کریں گے کہ سفرنامہ پڑھیں اور اس تصور کو وہ خطوط کے ذریعے ہم تک پہنچا بھی دیں گے تو ہمیں ضد بھی نہیں کہ انھیں مایوس ہی کر دیں۔ واللہ الموفق۔

آہ بے چارے خاں صاحب!

افسوس جتنا چاہے کر لیجئے مگر حیرت کی اسمیں کوئی بات نہیں کہ محترم و مکرم جناب وحید الدین خاں صاحب کے پندار کا پارہ روز بروز اوپر ہی کو جا رہا ہے۔ حیرت عدم علم کا نام ہے۔ علم آپ سب کو ہے کہ سید قطب رح جیسے شہداء اور اخوان المسلمون جیسی جماعت کی مظلومیت پر مسرت اور مسرت کا اظہار کرنے والوں میں محترم موصوف بھی شامل رہے ہیں اور فرعونیت کی وکالت تو انھوں نے بڑے کمالِ فن کے ساتھ کی ہے۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ فرعون کی روح ان کے دل و دماغ پر سایہ نہ ڈالتی ــــ

یہی بات ایک اور طرح بھی کہی جا سکتی ہے۔ فرعونیت کی طرح سرائی کا حوصلہ ہم جیسے بے نواؤں میں کہاں۔ یہ بہادری تو وہی لوگ دکھلا سکتے ہیں جن کی فطرت کو غرور و استکبار کے خزانے سے وافر حصہ ملا ہو۔ خاں صاحب نے بھی دن کی روشنی میں یہی بہادری دکھلائی لہذا نتیجہ بھی قدرتاً یہی ہونا چاہیئے تھا کہ ان کی کلاہِ پندار کا طرّہ آسمانوں سے باتیں کرنے لگے۔ وہ انا و بادِ غیری کے نشے میں بدمست ہو جائیں۔ پھر بھلا حیرت کیسی اور تعجب کیوں۔

لیکن حیرت اس پر ہے کہ وہ اپنے "خان" ہونے کا اعلان کرنے کے باوجود وقتاً فوقتاً لکھنوی نزاکتوں کی بھی نمائش کرتے ہیں اور انداز ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی مرزا جان عالم کی حرم سرا سے تشریف لا رہے ہوں۔

۵ اپریل ۶۸ء کا ہفت روزہ الجمعیۃ دیکھئے صفحہ ۱۷ پر ایک سوال و جواب چھاپا گیا ہے۔ سائل نے لکھا:۔

"ماہنامہ ..... نے جنوری و فروری کے شمارے میں آپ کے متعلق بہت سے ریمارک دیئے ہیں افسوس ہے کہ آپ نے ابھی تک الجمعیۃ کے جمعہ ایڈیشن میں کوئی صفائی نہیں دی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا ..... کے ریمارک صحیح ہیں۔ گو کہ میں خود ان کے ریمارک سے مطمئن نہیں ہوں۔ پھر بھی عام قارئین ممکن ہے غلط فہمی میں پڑ جائیں اس لئے گذارش کروں گا آئندہ اشاعت میں عامر صاحب کا صحیح صحیح جواب دیا جائے۔"

حافظ علیم الدین۔ گوہاٹی

خاں صاحب نے جواب دیا:۔

"اس خط کو پڑھیئے اور اندازہ کیجئے کہ اس ملک میں ایک اخبار نویس کو کیسے کیسے قارئین سے سابقہ پیش آتا ہے۔ یہاں ضروری ہے کہ کوئی بھی یاوہ گو جو کچھ اول فول لکھ کر چھاپ دے۔ ضروری ہے کہ اس کا جواب دیا جائے۔ اگر جواب نہ دیا گیا تو ناظرین یہ سمجھ لیں گے کہ کہنے والے نے جو کچھ کہا ہے وہ سب "حرف بحرف صحیح" ہے۔

افسوس کہ میرے لئے ایسے ناظرین کو مطمئن کرنا سخت مشکل ہے۔ کیونکہ میری طبیعت ایسی ہے کہ سطحی قسم کے پرچوں کو پڑھنا بھی میرے لئے مشکل ہے کجا کہ ان کی ہر بات کا جواب دیا جائے۔ میں اسکو گوارا کروں گا کہ کوئی شخص سطحی قسم کے اعتراضات اور الزامات کو پڑھ کر میرے بارے میں بدگمان ہو جائے۔ مگر یہ مجھے پسند نہیں ہے کہ میں اپنے وقت کو اتنا سستا کر دوں کہ وہ اس قسم کے جوابات کی نذر ہو جائے"

اب اسے تو چھوڑیئے کہ جواب کی زبان کتنی شائستہ ہے۔ "یاوہ گو" ہمیں اس لئے کہا گیا کہ ہم نے خاں صاحب کے آگے آئینہ رکھ کر یہ کہنے کی گستاخی کی تھی :-

حضور! یہ آپ ہیں!!

اور تجلی اور مدیر تجلی سطحی اس لئے ٹھیرا کہ اس نے موصوف کی مرحوم کتاب "تعبیر کی غلطی" پر تنقید کر کے "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" کا جرم کر ڈالا تھا۔ کتاب مری تو اپنی موت مگر موصوف شاید یہ سمجھے کہ قاتل ہے مدیر تجلی۔ پھر بھلا مدیر تجلی اور تجلی سے بڑھ کر یاوہ گو اور سطحی کون ہوگا۔

تصور ہمارا یہ بھی معمولی نہیں کہ جب ہم کسی پر نقد کرتے ہیں تو ابہام و اختصار سے کام نہیں لیتے۔ چبا چبا کر باتیں نہیں کرتے۔ اشارت و کنایت کا فن نہیں برتتے۔ جس ادارئیے کے تعلق سے سائل نے خاں صاحب کو مخاطب کیا ہے اس میں بھی ہم نے یہی تصور کیا کہ ثبوت اور شہادت کے طور پر خاں صاحب اور فارقلیط صاحب کی طویل عبارتیں نقل کر دیں۔ حوالے بھی کھول کر دیدیئے۔ اب فرار کی ساری راہیں بند۔ جو چیز چھپی ہے اسے کیسے کہدیں کہ نہیں چھپی اور جب چھپی ہے تو یہ کیسے کہدیں کہ دو اور دو چار نہیں ہوتے۔ جس کا جی چاہے پچھلا تجلی اٹھا کر دیکھ لے۔ جو کچھ ہم نے سپرد قلم کیا ہے وہ دو اور دو چار ہی کی طرح قطعی ہے۔ اب جواب اس کے سوا خاں صاحب دیتے بھی کیا کہ عامر یاوہ گو ہے۔ اول فول بکتا ہے۔ گویا بدزبانی پر تو حیرت بالکل مت کیجئے مگر حیرت اس پر ضرور کرنی چاہیئے کہ ایک خان۔ ۔۔ اپنی خانیت کے مسلسل اعلان بالجہر کے باوجود بڑی نزاکت سے یہ کہتا ہے :-

فرش مخمل پہ مرے پاؤں چھلے جاتے ہیں

کوئی پوچھے۔ اگر جناب اتنے ہی نازک طبع تھے کہ تجلی جیسے سطحی پرچوں کو پڑھنا تک مشکل تو پٹھانوں میں جنم لینے کا مشورہ آپ کو کس نے دیا تھا۔ خیر سے یہ لکھنوی ادائیں آپ پہلی ہی بار نہیں دکھا رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی کئی بار ایسے فقرے ہم سطحی لوگوں کی نظر سے گذر چکے ہیں جو منہ سے بول رہے تھے کہ ہمیں کسی دست حنائی لکھا ہے۔ مہندی لگانے کی عادت کسی خان میں تو ہم نے دیکھی نہیں۔ پھر کیا بات ہے کہ خاں صاحب کے معاملے میں یہ انہونی صاف نظر آرہی ہے۔

خیر وہ ہم سے کتنے ہی خفا ہوں اور کیسی ہی صلواتیں سنائیں ہم انشاء اللہ اگلی اشاعت میں اپنے ناظرین کو یہ ضرور بتائینگے کہ جو محترم خانصاحب اپنی دانست میں علم و فضل اور کلام و منطق کی سب سے اونچی چوٹی پر متمکن ہیں انھوں نے چوری کے فن میں بھی جرأت و شہامت کا ایک ایسا ریکارڈ قائم کیا ہے جسے پتھروں پر دے مارئیے مگر وہ ٹوٹے گا نہیں۔ ذکر ان کے اس کمال فن کا ابھی بعض اخباروں میں اگرچہ آچکا ہے مگر وہ ذرا مجمل ہے۔ ہم اس اجمال کو تفصیل کا جامہ پہنا کر اپنے خانصاحب کی عظمتوں کا ایک نیا باب کھولنا چاہتے ہیں۔ وہ ہزار ہمیں یاوہ گو، جاہل، بے مغز اور جو چاہے کہتے رہیں مگر ہم تو ان کے سرقوں کو بھی آرٹ ہی کے نقطۂ نظر سے دیکھیں گے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی عظمتوں پر ایک ایسا وقت بھی آئے گا جب وہ کسی مصیبت زدہ کی زبان سے "یاخدا" کی پکار سنکر سوچنے لگیں گے کہ یہ کسی نے ہمیں تو نہیں پکارا!!-

دس پیغمبر

- حضرت نوح علیہ السلام
- حضرت ہود علیہ السلام
- حضرت ابراہیم علیہ السلام
- حضرت یوسف علیہ السلام
- حضرت شعیب علیہ السلام
- حضرت موسیٰ علیہ السلام
- حضرت یونس علیہ السلام
- حضرت سلیمان علیہ السلام
- حضرت عیسیٰ علیہ السلام
- حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

قیمت مجلد ——— چار روپے۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

ایجنٹ حضرات نوٹ کریں

مدیر تجلی کے سفر حج کے باعث دو ماہ کا جو خلا تجلی کی اشاعتوں میں پیدا ہو گیا ہے اسے پُر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اگلا شمارہ بھی دو ماہ کا مشترکہ شمارہ ہو۔ یعنی بابت مئی وجون۔ اسی طرح نظم درست ہو سکتا ہے۔ صفحات اس کے بھی عام اشاعتوں سے زیادہ ہوں گے اور قیمت ڈیڑھ روپیہ ہو گی۔

خریداران تجلی ملاحظہ فرمائیں

دو ماہ کی یکجا اشاعت سے خریدار حضرات کو جو جزوی نقصان صفحات کے مجموعی اوسط میں پہنچتا ہے اس سے ہم بے خبر نہیں ہیں۔ لیکن ہم انھیں اطمینان دلاتے ہیں کہ اس نقصان کی تلافی ہم ایسے ہی خاص نمبروں سے کرتے رہیں گے جیسے ماضی میں پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ سال رواں میں بھی ایک ضخیم خاص نمبر اشاعت پذیر ہو سکے گا۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔

منیجر تجلی

تازہ بتازہ نوبہ نو

اسلامی مذاہب متعدد وقیع ترین کتابوں کے نامور مؤلف جناب استاد ابوزہرہ کی ایک اور کتاب اردو لباس میں۔ اس میں ان تمام فرقوں کے عقائد و آراء اور احوال و کوائف کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے جو پوری تاریخ اسلامی میں کسی بھی دور اور کسی بھی ملک میں نمودار ہوئے۔ مترجمہ:۔ غلام احمد حریری

قیمت ـــــ مجلد نو روپے۔

مجلۃ الاحکام فقہ اسلامی کے شعبۂ مالیات کا وہ قانونی ذخیرہ جو خلافتِ اسلامیہ میں ۱۹۱۸ء تک عدالتوں کا دستور العمل رہا۔ اس کے مطالعے سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ اسلامی قانون اپنی وسعت، جامعیت اور جزرسی میں کسی بھی ترقی یافتہ قانون سے کم نہیں ہے بلکہ فائق ہی ہے۔ اردو ترجمہ عبدالقدوس ہاشمی

قیمت ـــــ مجلد دس روپے

اصول فقہ اسلام مصنفہ:۔ سر عبدالرحیم۔ ترجمہ:۔ مولوی مسعود علی۔

اصولِ فقہ پر ایک مکمل اور مستند کتاب جو فقہ کے جملہ عنوانات پر بے نظیر تشریح پیش کرتی ہے جس میں کم و بیش ستر کتابوں سے استفادہ حاصل کیا گیا ہے۔

قیمت اعلیٰ ایڈیشن۔ پندرہ ۱۵/- روپے سستا ایڈیشن۔ نو ۹/- روپے

انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ مصنفہ علامہ عبداللہ یوسف علی (ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ ایم) عدالتوں کا آغاز، قوانین کا اجراء، انجمنوں کا قیام، اخبارات کی آزادی، سیاسی اور سماجی تحریکیں اور اس دور کی نامور شخصیتوں کا ذکر اور بدلتے ہوئے اقدار کی مکمل عکاسی۔ اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ قیمت اعلیٰ ایڈیشن۔ بارہ ۱۲/- روپے سستا ایڈیشن ساڑھے سات روپے

تاریخ عہد بنی اُمیہ مصنفہ:۔ ابوالحسن علی بن مسعودی بغدادی۔ ترجمہ:۔ سید محمد ابراہیم

عہد بنی اُمیہ پر ایک مستند اور بنیادی تاریخی مآخذ۔ ہر لحاظ سے عمدہ۔ قیمت ـــ چھ روپے ۶/- پیسے۔

تاریخ تمدن اسلام مکمل مصنفہ:۔ علامہ جرجی زیدان ترجمہ:۔ مولوی محمد حلیم انصاری

کم سے کم الفاظ میں اسلام کے تمدن کی ایک ایسی مکمل و مستند تاریخ جس سے بہتر آج تک کسی نے نہیں لکھی۔

قیمت مکمل ہر دو حصہ ـــ بتیس ۳۲/- روپے

تعلیم غوثیہ مؤلف:۔ سید شاہ گل حسن قلندر۔ ترجمہ:۔ سید غوث علی شاہ قلندر۔

توحید و تصوف اور حقائق و معارف کا ایک خزانہ۔ جو طالبانِ حق کیلئے ایک مشعلِ راہ سے کم نہیں۔ سولہ ۱۶/- روپے

اسماءِ حسنیٰ کی برکات اللہ تعالیٰ کے مقدس ناموں کے وظائف و خواص، اثرات برکات اور تعویذات کا ایک اچھا مجموعہ۔ مجلد مع کور

قیمت ـــ تین ۳/- روپے۔

روحِ کلام غالب مصنفہ:۔ مرزا عزیز بیگ مرزا

غزلیاتِ غالب کی شعری تشریح

اس مجموعہ میں غالب کی تمام ہی غزلوں کی تضمین کچھ اس انداز سے کی ہے جیسے غالب کے کلام کی روح کھنچ کر صفحۂ قرطاس پر آگئی ہو۔

کتابت و طباعت عمدہ مجلد مع کور۔

قیمت ـــ تین روپے۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔ پی)

مستقل عنوان

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں؟

زمین کی تاریخ جو غیر معمولی واقعات کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتی ہے جزیرہ نمائے عرب کا ایک معمولی واقعہ اس طرح نوٹ کر رہی تھی ـــــ کہ اسلامی قلمرو کے جلیل القدر سربراہ عمر فاروقؓ کے ایک مطالبے کو قلمرو کا ایک شہری بلا تکان مسترد کر رہا ہے۔ مطالبے کی نوعیت بھی ذاتی اندازکی نہ تھی بلکہ خالصتاً للّٰہیت کی شان اس میں صاف دکھائی دے رہی تھی ـــــ ـــــ پھر مطالبے کو پیش بھی معقولیت کے پورے آداب کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔ اور پھر اس مطالبے کی ہر متبادل شکل کو وہ شہری اپنی کسی صواب دید کے بل پر رد کئے چلا جا رہا تھا۔

صورتِ حال یہ تھی کہ خلیفۂ رسول مسجد نبویؐ کی وسعت میں اضافہ کرنے کا خاکہ بنا رہا تھا اور اس توسیع کے نقشے کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا مکان جو مسجد سے ملا ہوا تھا حاصل کر کے اللہ کے گھر میں شامل کر لیا جائے لیکن مالک مکان نے اس مطالبے کو نامنظور کر دیا تھا اور اپنے اس پیدائشی حق کو اس شان سے استعمال کیا تھا کہ انکار کی کوئی وجہ بھی بتانا ضروری نہ سمجھا تھا۔

تمام امکانات اس کے جمع ہو رہے تھے کہ سربراہِ مملکت کو غصہ آجائے۔ لیکن ہوا یہ کہ انھوں نے اس انکار کے جواب میں بات چیت میں اور زیادہ معقولیت کا لوچ پیدا کرنا شروع کیا۔ انھوں نے کہا:۔

"آپ یہ مکان ہمیں فروخت کر دیجئے تاکہ اسکی قیمت سے دوسرا بہتر مکان تعمیر کر سکیں اور اللہ کے گھر میں توسیع ہو جائے۔"

"جی نہیں۔"

"اچھا ـــــ اگر فروخت کرنے میں طبیعت پر کوئی بار ہوتا ہے تو راہِ خدا میں نذر کر دیجئے۔"

"یہ بھی نہیں۔"

"اچھا ـــــ تو ایسا کیجئے کہ مجھے کسی شکل میں دینے کی بجائے آپ بہ نفسِ نفیس یہ توسیع کا کام ہمرا انجام دے دیجئے۔"

"جی نہیں!!" حضرت عباسؓ نے تیسری بار انکار کرتے ہوئے کہا۔

"ان تین شکلوں میں سے کوئی بھی ایک شکل آپ کو ضرور ماننی ہوگی۔" خلیفۂ وقت نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"میں ان میں سے کوئی بھی صورت تسلیم نہیں کرتا۔" صاف صاف جواب ملا۔

معاملے نے ایک انتہائی نازک شکل اختیار کر لی تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اس کے جواب میں اپنی امتیازی حیثیت کو درمیان سے ہٹاتے ہوئے آخری راہ پیش کر دی۔

"اچھا ـــــ تو پھر کسی تیسرے آدمی سے فیصلہ کرا لیا جائے۔"

یہ بات تسلیم کر لی گئی اور قرآن و حدیث کے ممتاز ترین عالم حضرت ابی بن کعبؓ کا انتخاب اس فیصلے کے لئے ہوا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں آدمی جن میں ایک خلیفۂ وقت تھا اور دوسرا ایک شہری، اس صاحبِ علم وفضل کی عدالت میں پیش ہوئے جن کا نام ناحی ابی بن کعبؓ تھا۔ ابن کعبؓ نے حکم کی پوزیشن میں دونوں فریق کو عدل وانصاف کی میزان میں یکساں درجہ دیتے ہوئے مقدمے کی کارروائی شروع کی۔ خلیفۂ وقت کی شخصیت کو سب سے پہلے جرح کی منزل سے گذرنا پڑا۔

"آپ کو کیا حق حاصل ہے"۔ ابن کعب نے جرح کرتے ہوئے حضرت عمر فاروقؓ سے پوچھا کہ "رضامندی کے بغیر ان کی چیز لینے کی کوشش کریں؟"

"یہ نکتہ آپ نے کہاں سے اخذ کیا ہے؟" خلیفۂ رسولؐ نے ادب کے ساتھ جواب میں سوال کیا "قرآن سے یا حدیث سے؟"

"حدیث سے" قاضی نے جواب دیا" اور وہ اس طرح کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب بیت المقدس کی عمارت کھڑی کی تھی تو اس کی ایک دیوار کسی دوسرے کی زمین پر اٹھادی گئی تھی، وہ گر پڑی۔ حضرت سلیمانؑ کے پاس وحی آئی کہ اجازت لے کر بنوائیے"۔

اس کا جواب یہ تھا کہ حضرت عمرؓ نے اس کے بعد کوئی جواب نہیں دیا ـــ کوئی چون وچرا تک نہیں کی۔ بلکہ سر جھکا دیا۔ اور بالکل چپ ہوگئے۔

مسلمانوں کے درمیان اصولی اور قانونی بحث ختم ہوگئی مگر اسی وقت اخوت وایثار کا جاں نواز نغمہ ان عباسؓ کے دل کی دھڑکنوں سے بلند ہوا جو اتنی دیر سے اس مطالبے کو مسترد کرتے آرہے تھے۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی حضرت عمرؓ کی اس بیچارگی، معصومانہ بیچارگی کو دیکھنے کی تاب نہ لاسکے۔ مکان کا وہ مطالبہ اب ایک خاموش مطالبے میں تبدیل ہوا اور اسی دم منظور کرلیا گیا!

"میں اس کو مسجد میں شامل کرتا ہوں"۔ حضرت عباسؓ کی جذبات چھلکاتی ہوئی آواز فضا میں بلند ہوئی اور خدا کے دونوں بندوں کی نظروں میں ایک سنسنی خیز تبادلہ ہوا ـــ اور دونوں کے چہرے دو مسرتوں سے چمک اٹھے ـــ کھل گئے۔

کیسا بابرکت تھا وہ اقدام! ـــ جو اب محض اللہ کے لئے انجام پایا!! بندے کے لئے نہیں! ـــ اپنی بڑائی کیلئے بھی نہیں۔ اور کیسی اتھاہ ہوگی وہ خوشی جو اس وقت فریقین کو حاصل ہوئی ہوگی ـــ کون ہے جو اس کا اندازہ ٹھیک ٹھیک اور پوری طرح کرسکے؟ ـــ اور کیسا بھلا تھا وہ زمانہ جس میں عدل وانصاف کے دروازے عدل وانصاف پر کھلے ہوئے تھے اور "ظلم" پر ایک دم بند تھے! ـــ جس کے دروازے پر حکمراں اور محکوم دونوں کو ایک ہی درجہ حاصل تھا اور وہ یہ کہ بندوں میں کوئی بندہ "خدا" نہیں محض بندۂ خدا ہے اور بس۔ زندگی آج بھی انھی تمام بوقلمونیوں کے ساتھ وہی ہے جو اس وقت تھی مگر اس کا یہ "حسن" آج کہیں نظر آتا ہے؟ ـــ اگر ایمان اسی کیفیت میں ہے جس میں وہ کل تھا تو اس کا وہ حسن وجمال آخر کہاں چلا گیا؟!.....

اس مقدمے میں جو ہستی عہدۂ قضا پر متمکن نظر آرہی ہے ایک بار خلیفۂ وقت کے خلاف مدعی کی شکل میں بھی دکھائی دی تھی ـــ حضرت ابیؓ بن کعب جو قرآن مجید کے بہترین رازداں اور عالم تھے اور حضرت عمر فاروقؓ جو اس وقت رسول اللہؐ کے خلیفہ کے بلند مقام پر مامور تھے، ان دونوں میں ایک باغ کی ملکیت پر جھگڑا کھڑا ہوگیا تھا۔ جب حضرت ابیؓ ابن کعب کو یہ محسوس ہوا کہ جس حصے پر ان کا حق ہے وہ انھیں نہیں مل رہا ہے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے ـــ اس بات پر نہیں کہ متاعِ دنیا ہاتھ سے جارہی ہے بلکہ اس لئے کہ عدل اور حق کے اس عہد زریں میں کہیں نصاف کا خون تو نہیں ہورہا ہے ـــ

"آپ کے عہدِ خلافت میں اور یہ باتیں!"... ابیؓ بن کعب نے حضرت عمر فاروقؓ پر دکھ بھری نظر ڈالتے ہوئے روکر کہا۔

"نہیں نہیں!" حضرت عمر فاروقؓ پکار اٹھے "ہرگز میری نیت یہ نہیں کہ خدانخواستہ کسی کا حق مارا جائے ـــ میں آپ کو اس کا موقع دیتا ہوں کہ جس مسلمان کے فیصلے پر آپ کا دل مطمئن ہو اس کے سامنے ہم دونوں کو پیش کیا جائے اور وہ جو فیصلہ کردے اس کو دونوں تسلیم کرلیں"۔

"اچھا" وہ بولے "تو پھر زیدؓ بن ثابت کے یہاں مقدمہ پیش ہوگا"۔

اور ـــ حضرت ابی بن کعب نے خلیفۂ وقت پر مقدمہ دائر کر دیا۔ وقت کے حکمراں اور اللہ کے رسولؐ کا جانشین ایک عام آدمی کی طرح عدالت میں حاضر ہوا ـــ دعویٰ سنا گیا اور مدعا علیہ پر جرح ہوئی۔

"بات یہ نہیں ہے" حضرت عمر فاروقؓ نے جواب دیا اور حضرت ابی بن کعب پر حملہ کرنے کے بجائے یہ کہا کہ "آپ بھول رہے ہیں۔ یاد کیجئے"۔ حضرت ابی بن کعب نے بھی حضرت عمرؓ پر حملہ نہیں کیا اور اپنے اوپر ضرورت سے زیادہ اعتماد بھی نہیں کیا ـــ بلکہ اس وقت سوچنے لگے، یاد کرنے کی پوری کوشش کرنے لگے۔

"اب مجھے کچھ یاد نہیں آتا" اور اسی پر حضرت ابی بن کعب کا بیان ختم ہو گیا۔

قاضی نے مدعی کی اس کیفیت کو دیکھنے کے باوجود کوئی فیصلہ نہیں دیا بلکہ حضرت عمر فاروقؓ سے بیان طلب کیا۔ انھوں نے تعمیل حکم کی اور واقعات کی وہ تفصیل سامنے رکھی جو حضرت ابن کعب کو یاد نہیں رہی تھی۔ لیکن اس کے بعد بھی قاضی نے فیصلہ نہیں دیا۔ وہ مدعی کی طرف متوجہ ہوئے اور اس سے ثبوت طلب کیا۔

"میرے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں ہے اور وہ باتیں یاد بھی نہیں ہیں جو کہی جا رہی ہیں"۔ مدعی نے صاف صاف کہہ دیا۔ اسلئے کہ جھوٹ بولنے کی جرأت ان میں نہ تھی ـــ جھوٹ بولنے کی خواہش بھی ان کے ضمیر کی بارگاہ میں سنگین جرم کا درجہ رکھتی تھی ـــ اب ایک ہی شکل باقی تھی کہ مقدمے کا فیصلہ کرنے سے پہلے امیر المومنین سے قسم لی جائے ـــ لیکن قاضی نے محسوس کیا کہ اتنے مسلّمہ قسم کے خدا ترس سے "قسم" کا مطالبہ کرنا بھی ایک طرح کا ظلم شمار ہوگا ـــ ایک ایسا سوءِ ظن ہوگا جس کا جواز موجود نہیں۔ اور قسم کوئی معمولی بات نہیں تھی کہ بلا معقول وجہ کے لے لی جاتی۔

"تو پھر آپ امیر المومنین سے قسم نہ لیجئے" حضرت زیدؓ بن ثابت نے سفارش پیش کی۔ لیکن اس کے جواب میں حضرت ابی بن کعب کے بجائے خود حضرت عمر فاروقؓ نے اس سفارش سے اختلاف کیا اور حضرت ابی بن کعب کچھ نہ بولے۔

"اگر قسم ضروری ہو تو وہ بھی لے لیجئے" امیر المومنینؓ نے نے اپنی پاکیزہ شخصیت کو اس آزمائش کے لئے بھی از خود پیش کر دیا۔ لیکن قاضی اور مدعی دونوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ انصاف کے تمام تقاضے ادب و احترام کے ساتھ پورے ہو چکے تھے۔ اور چونکہ جھگڑا "دنیا" کے لئے نہیں "عدل اور حق" کیلئے تھا اس لئے جوں ہی یہ تقاضے پورے ہوئے سارا جھگڑا آناً فاناً ختم ہو کر رہ گیا! ـــ کیسا عجیب تھا وہ مقدمہ جس میں ہارنے والا بھی خوش تھا اور جیتنے والا بھی! ـــ اس لئے کہ دونوں محسوس کر رہے تھے کہ یہ ان دونوں کے خدا کی جیت تھی ـــ یہ حق اور انصاف کی جیت تھی۔ ذاتیات کے خانے میں دونوں نے خود اپنے آپ کو شکست دیدی تھی۔ ہاں یہ تھا وہ زمانہ جس کی آنکھ نے اس زمین پر "آسمانی بادشاہت" کا حقیقی نقشہ دیکھا تھا۔ ـــ جب خدا کی جنت اسی خاکدان پر ـــ اسی زمین پر اُتر آئی تھی۔ اور آج وہی زمین ہے جس پر ہر طرف جہنم بھڑک رہے ہیں۔ دوزخ کے عذاب لگاتار اُترتے چلے آ رہے ہیں! ـــ اگر ہمارے سینوں میں وہی ایمان و یقین زندہ ہے جو اُس وقت کے لوگوں میں تھا تو یہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ان کے ایمان پر دنیا میں جنت اُترتی تھی اور ہمارے ایمان پر اس دنیا میں دوزخ اُتر رہا ہے! ـــ سوچنے کی بات ہے، فکر کی بات ہے! کس قدر فکر کی بات ہے!۔

"یا رسول اللہؐ!" کسی بندۂ خدا نے خدا کے نمائندے سے سوال کیا "ہم بیمار ہوتے ہیں یا اور کوئی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ کیا اس دُکھ درد میں بھی ثواب ہے؟ ـــ کیا... کیا یہ بیماریاں بھی عبادت ہیں ـــ کیا یہ پریشانیاں بھی عبادت کی ایک قسم ہیں؟"۔

"ہاں ان سے آدمی کے گناہوں کی دُھلائی ہوتی ہے"۔ حضورؐ نے جواب میں اس طرح کی بات ارشاد فرمائی۔

اس محفل میں جہاں اور تھے وہاں حضرت ابی بن کعب بھی تھے۔ رسولؐ خدا نے آخرت کی ان بندوں کو کیسی عظیم بشارت دی تھی۔ لیکن ظاہر ہے آخرت کے انعامات ان لوگوں کی نظر میں بہت بڑی چیز تھے۔ بے حد قیمتی ـــ بہت ہی گراں قدر۔

اس لئے حضرت ابیؓ بن کعب کے دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ دنیا کی بڑی بڑی تکالیف کے متعلق اور بہت سخت بیماریوں ہی کے متعلق یہ بشارت دی جا رہی ہوگی۔ چھوٹی موٹی بیماریاں اور معمولی پریشانیاں اس اعزاز سے محروم ہوں گی۔

"کیا چھوٹی چھوٹی تکالیف سے بھی گناہ دھلتے ہیں اے رسولؐ خدا؟" ابیؓ بن کعب سے رہا نہ گیا اور سوال کر ہی لیا۔

"ہاں" حضورؐ نے لوگوں کی خوشی کو دوبالا کرتے ہوئے خبر دی "ایک کانٹے کی کھٹک سے بھی کفارۂ سیئات ہوتا ہے۔"

یکایک ابیؓ بن کعب مسرت و شوق سے بیتاب ہو گئے۔ آخرت کی کامیابی کا یہ راستہ بہت ہی قریب کا اور آسان راستہ نظر آیا۔۔۔ وہ تڑپ گئے کہ اس راستے سے خدا کی رحمت کے گھر میں کسی طرح داخل ہو جائیں اور دائمی عذاب کے الاؤ سے رستگاری حاصل کر لیں۔ انھوں نے سوچا کہ وہ کونسی بیماری ہو سکتی ہے جو معمولی بھی ہو اور مسلسل بھی۔ ایک لمحہ کے لئے جس کا سلسلہ نہ ٹوٹے اور زندگی کا ہر سانس اسکی برکت سے کفارۂ سیئات ہو کر رہ جائے۔۔۔ مومن خدا کی روشنی میں دیکھا کرتا ہے اور وہ مومن تھے اس لئے وہ فوراً ہی ایک بیماری کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔۔۔ بیتابانہ پکار اٹھے "اے کاش مجھے ہر وقت بخار چڑھا رہتا۔ لیکن ایسا کہ حج، عمرہ، نماز اور جہاد ادا کرنے کے قابل رہا کرتا۔"

فضائے کائنات میں دعاؤں کی نہ جانے کتنی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ لیکن کیا کبھی کسی نے تڑپ کر ایسی بھی دعا خدا سے مانگی ہوگی۔ یقیناً یہ پکار اسی قابل تھی کہ سیدھی عرش پر پہنچے۔۔۔ اور یہ دعا اسی طرح حریم اجابت تک پہنچی۔ حرارت کی ایک خفیف مقدار رگ و پے میں سرایت کر گئی۔۔۔ جب ان کے جسد اطہر پر ہاتھ رکھا جاتا وہ گرم ملتا۔ لیکن فرائض کی ادائیگی میں اس سے کبھی کوئی خلل واقع نہ ہوا۔۔۔ کس قدر سستے داموں کفارۂ سیئات کی یہ نعمت حاصل ہوئی۔ لیکن اس کی طلب کے لئے ہاتھ پھیلانا اور یہ نعمت تڑپ کر طلب کرنا کوئی سستی چیز نہیں۔ بڑی مہنگی ہے۔ کارے دارد! اس دعا کی قبولیت کا یہ حسین منظر دیکھ کر بھی اس دعا کی خواہش و جرأت ہر کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی۔ یہ جرأت شوق صرف "مسلمان" کو ملتی ہے منافق کو کبھی نہیں ملتی۔ یہ بھی ایک مقام آزمائش ہے کہ ہماری زندگی میں ایمان کتنا رہ گیا ہے اور نفاق کتنا گھس آیا ہے۔۔۔ جنون بندگی اور فکر آخرت کی ان اداؤں کو ہم عقل کی ترازو میں تولنے بیٹھ جاتے ہیں یا عشق کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہم اس ادا پر ہنستے ہیں یا اپنے حال پر روتے ہیں۔۔۔۔

تریاق معدہ

تبخیر معدہ۔ قراقر۔ حبس ریاح۔ نفخ۔ ضعف جگر۔ قبض اور معدے کی جملہ خرابیوں میں مفید اور مؤثر۔ معدہ و جگر کا فعل درست کر کے صالح خون پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔

پیٹ کے درد کو فوری طور پر دور کرتا ہے۔
پرسوت و اسہال کی بیماری میں بھی جلد اثر دکھاتا ہے۔

۲۱ دن کی خوراک کا پیکنگ تین روپے۔
محصول ڈاک ڈیڑھ روپیہ
(اگر دُرِّ نجف کے ہمراہ منگائیں گے تو دونوں چیزیں ایک ہی محصول میں مل جائیں گی)
ترکیب استعمال ہمراہ
بھیجی جاتی ہے
منگانے کا پتہ

دار الفیض رحمانی
دیوبند
(یو۔پی)

تفہیم القرآن

(مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی)

پارہ ۲۷

سورۂ واقعہ - آیات ۱ تا ۵۷

نام پہلی ہی آیت کے لفظ اَلْوَاقِعَہ کو اس سورت کا نام قرار دیا گیا ہے۔

زمانۂ نزول حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے سورتوں کی جو ترتیب نزول بیان کی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ پہلے سورۂ طٰہٰ نازل ہوئی۔ پھر الواقعہ اور اس کے بعد الشعراء (الاتقان للسیوطی) یہی ترتیب عکرمہؓ نے بھی بیان کی ہے (بیہقی، دلائل النبوۃ)

اس کی تائید اُس قصہ سے بھی ہوتی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے کے بارے میں ابن ہشام نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے۔ اُس میں یہ ذکر آتا ہے کہ جب حضرت عمرؓ اپنی بہن کے گھر میں داخل ہوئے تو سورۂ طٰہٰ پڑھی جا رہی تھی اُن کی آہٹ سنکر ان لوگوں نے قرآن کے اوراق چھپا دیئے۔ حضرت عمرؓ پہلے تو بہنوئی پر پل پڑے اور جب بہن انکو بچانے آئیں تو اُن کو بھی مارا یہاں تک کہ ان کا سر پھٹ گیا۔ بہن کا خون بہتے دیکھ کر حضرت عمرؓ کو سخت ندامت ہوئی اور انھوں نے کہا۔ اچھا مجھے وہ صحیفہ دکھاؤ جسے تم نے چھپا لیا ہے۔ دیکھوں تو سہی اس میں کیا لکھا ہے۔ بہن نے کہا "آپ اپنے شرک کی وجہ سے نجس ہیں وانہ لا یمسّہ الا الطاھر۔ اس صحیفے کو صرف طاہر آدمی ہی ہاتھ لگا سکتا ہے۔" چنانچہ حضرت عمرؓ نے اٹھ کر غسل کیا اور پھر اس صحیفے کو لے کر پڑھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اُس وقت سورۂ واقعہ نازل ہو چکی تھی کیونکہ اسی میں آیت لَا یَمَسُّہٗ اِلَّا الْمُطَھَّرُوْنَ وارد ہوئی ہے اور یہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ ہجرتِ حبشہ کے بعد ۵ نبوی میں ایمان لائے ہیں۔

موضوع اور مضمون اس کا موضوع آخرت، توحید اور قرآن کے متعلق کفار مکہ کے شبہات کی تردید ہے۔ وہ سب سے زیادہ جس چیز کو ناقابل یقین قرار دیتے تھے وہ یہ تھی کہ کبھی قیامت برپا ہو گی جس میں زمین و آسمان کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر تمام مرے ہوئے انسان دوبارہ جلا اُٹھائے جائیں گے اور ان کا محاسبہ ہوگا اور نیک انسان جنت کے باغوں میں رکھے جائیں گے اور گناہگار انسان دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔ اُن کا کہنا یہ تھا کہ یہ سب خیالی باتیں ہیں،

جن کا عالمِ واقعہ میں پیش آنا غیر ممکن ہے۔ اس کے جواب میں فرمایا کہ جب وہ واقعہ پیش آجائے گا اُس وقت کوئی یہ جھوٹ بولنے والا نہ ہوگا کہ وہ پیش نہیں آیا ہے، نہ کسی کی یہ طاقت ہوگی کہ اسے آتے آتے روک دے یا واقعہ سے غیر واقعہ بنا دے۔ اس وقت لازماً تمام انسان تین طبقات میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک، سابقین۔ دوسرے، عام صالحین۔ تیسرے وہ لوگ جو آخرت کے منکر رہے اور مرتے دم تک کفر و شرک اور گناہِ کبیرہ پر جمے رہے۔ ان تینوں طبقات کے ساتھ جو معاملہ ہوگا اسے تفصیل کے ساتھ آیت ۷ سے ۵۶ تک بیان کیا گیا ہے۔

اس کے بعد آیت ۵۷ سے ۷۴ تک اسلام کے اُن دونوں بنیادی عقائد کی صداقت پر پے در پے دلائل دیئے گئے ہیں جن کو ماننے سے کفار انکار کر رہے تھے، یعنی توحید اور آخرت۔ ان دلائل میں زمین و آسمان کی دوسری تمام چیزوں کو چھوڑ کر انسان کو خود اس کے اپنے وجود کی طرف اور اُس غذا کی طرف جسے وہ کھاتا ہے اور اُس پانی کی طرف جسے وہ پیتا ہے اور اس آگ کی طرف جس سے وہ اپنا کھانا پکاتا ہے، توجہ دلائی گئی ہے اور اسے اس سوال پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے کہ تو جس خدا کے بنانے سے بنا ہے اور جس کے دیئے ہوئے سامانِ زیست پر پل رہا ہے اس کے مقابلے میں خود مختار ہونے یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی بجا لانے کا آخر تجھے حق کیا ہے؟ اور اس کے متعلق تو نے یہ کیسے گمان کر لیا کہ وہ ایک دفعہ تجھے وجود میں لے آنے کے بعد ایسا عاجز و درماندہ ہو جاتا ہے کہ دوبارہ تجھ کو وجود میں لانا چاہے بھی تو نہیں لا سکتا؟

پھر آیت ۷۵ سے ۸۲ تک قرآن کے بارے میں ان کے شکوک کی تردید کی گئی ہے اور ان کو یہ احساس دلایا گیا ہے کہ بایں نصیبو، یہ عظیم الشان نعمت تمہارے پاس آئی ہے اور تم نے اپنا حصہ اس نعمت میں یہ رکھا ہے کہ اسے جھٹلاتے ہو اور اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اُلٹی بے اعتنائی برتتے ہو۔ قرآن کی صداقت پر دو مختصر سے فقروں میں یہ بے نظیر دلیل پیش کی گئی ہے کہ اس پر کوئی غور کرے تو اس کے اندر ویسا ہی محکم نظام پائے گا جیسا کائنات کے تاروں اور سیاروں کا نظام محکم ہے، اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مصنف وہی ہے جس نے کائنات کا یہ نظام بنایا ہے۔ پھر کفار سے کہا گیا ہے کہ یہ کتاب اُس نوشتۂ تقدیر میں ثبت ہے جو مخلوقات کی دسترس سے باہر ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ اسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شیاطین لاتے ہیں حالانکہ لوحِ محفوظ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک جس ذریعہ سے یہ پہنچتی ہے اس میں پاک نفس فرشتوں کے سوا کسی کا ذرہ برابر بھی کوئی دخل نہیں ہے۔

آخر میں انسان کو بتایا گیا ہے کہ تو کتنی ہی لن ترانیاں ہانکے اور اپنی خود مختاری کے گھمنڈ میں کتنا ہی حقائق کی طرف سے اندھا ہو جائے، مگر موت کا وقت تیری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے۔ اُس وقت تو بالکل بے بس ہوتا ہے۔ اپنے ماں باپ کو نہیں بچا سکتا۔ اپنی اولاد کو نہیں بچا سکتا۔ اپنے پیروں اور پیشواؤں اور محبوب ترین لیڈروں کو نہیں بچا سکتا۔ سب تیری آنکھوں کے سامنے مرتے ہیں اور تو دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اگر کوئی بالاتر طاقت تیرے اوپر فرمانروا نہیں ہے اور تیرا یہ زعم درست ہے کہ دنیا میں بس تو ہی تو ہے، کوئی خدا نہیں ہے تو کسی مرنے والے کی نکلتی ہوئی جان کو پلٹا کیوں نہیں لاتا؟ جس طرح تو اس معاملے میں بے بس ہے اُسی طرح خدا کے محاسبے اور اس کی جزا و سزا کو بھی روک دینا تیرے اختیار میں نہیں ہے۔ تو خواہ مانے یا نہ مانے موت کے بعد ہر مرنے والا اپنا انجام دیکھ کر رہے گا۔ مقربین میں سے ہو تو مقربین کا انجام دیکھے گا۔ صالحین میں سے ہو تو صالحین کا انجام دیکھے گا۔ اور جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہو تو وہ انجام دیکھے گا جو ایسے مجرموں کے لئے مقدر ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا تو کوئی اس کے وقوع کو جھٹلانے والا نہ ہوگا[1]۔ تہ و بالا کر دینے والی آفت ہوگی[2]۔ زمین اس وقت یکبارگی ہلا ڈالی جائے گی[3] اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے کہ پراگندہ غبار بن کر رہ جائیں گے۔ تم لوگ اس وقت تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے[4]۔

---

[1] اس فقرے سے کلام کا آغاز خود یہ ظاہر کر رہا ہے کہ یہ اُن باتوں کا جواب ہے جو اُس وقت کفار کی مجلسوں میں قیامت کے خلاف بنائی جا رہی تھیں۔ زمانہ وہ تھا جب مکہ کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نئی نئی اسلام کی دعوت سن رہے تھے۔ اُس میں جو چیز انھیں سب سے زیادہ عجیب اور بعید از عقل و امکان نظر آتی تھی وہ یہ تھی کہ ایک روز زمین و آسمان کا یہ سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا اور پھر ایک دوسرا عالم برپا ہوگا جس میں سب اگلے پچھلے مرے ہوئے لوگ دوبارہ زندہ کئے جائیں گے۔ یہ بات سُن کر حیرت سے اُن کے دیدے پھٹے کے پھٹے رہ جاتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ ایسا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ آخر یہ زمین، یہ پہاڑ، یہ سمندر، یہ چاند، یہ سورج کہاں چلے جائیں گے۔ صدیوں کے گڑے مُردے کیسے جی اٹھیں گے۔ مرنے کے بعد دوسری زندگی اور پھر اس میں بہشت کے باغ اور جہنم کی آگ، آخر یہ خواب و خیال کی باتیں عقل و ہوش رکھتے ہوئے ہم کیسے مان لیں؟ یہی چہ میگوئیاں اُس وقت مکہ میں ہر جگہ ہو رہی تھیں۔ اس پس منظر میں فرمایا گیا ہے کہ جب وہ ہونے والا واقعہ پیش آجائے گا اُس وقت کوئی اُسے جھٹلانے والا نہ ہوگا۔

اِس ارشاد میں قیامت کے لئے "واقعہ" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی قریب قریب وہی ہیں جس کے لئے اُردو زبان میں ہونی اور شُدنی کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ یعنی وہ ایسی چیز ہے جسے لازماً پیش آکر ہی رہنا ہے۔ پھر اس کے پیش آنے کو "وُقعۃ" کہا گیا ہے جو عربی زبان میں کسی بڑے حادثے کے اچانک برپا ہو جانے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لَیْسَ لِوَقْعَتِہَا کَاذِبَۃٌ کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کے وقوع کا ٹل جانا اور اس کا آتے آتے رُک جانا اور اُس کی آمد کا پھیر دیا جانا ممکن نہ ہوگا۔ یا بالفاظِ دیگر کوئی طاقت پھر اُس کو واقعہ سے غیر واقعہ بنا دینے والی نہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ کوئی متنفس اُس وقت یہ جھوٹ بولنے والا نہ ہوگا کہ وہ واقعہ پیش نہیں آیا ہے۔

[2] اصل الفاظ ہیں خافضۃ رافعۃ۔ "گرانے والی اور اٹھانے والی"۔ اس کا ایک مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ سب کچھ اُلٹ پلٹ کر کے رکھ دے گی۔ نیچے کی چیزیں اوپر اور اوپر کی چیزیں نیچے ہو جائیں گی۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گرے ہوئے لوگوں کو اٹھانے والی اور اٹھے ہوئے لوگوں کو گرانے والی ہوگی۔ یعنی اس کے آنے پر انسانوں کے درمیان عزت و ذلت کا فیصلہ ایک دوسری ہی بنیاد پر ہوگا جو دنیا میں عزت والے بنے پھرتے تھے وہ ذلیل ہو جائیں گے اور جو ذلیل سمجھے جاتے تھے وہ عزت پائیں گے۔

[3] یعنی وہ کوئی مقامی زلزلہ نہ ہوگا جو کسی محدود علاقے میں آئے بلکہ پوری کی پوری زمین بیک وقت ہلا ماری جائے گی۔ اُس کو یک لخت ایک زبردست جھٹکا لگے گا جس سے وہ لرز کر رہ جائے گی۔

[4] خطاب اگرچہ بظاہر اُن لوگوں سے ہے جنھیں یہ کلام سُنایا جا رہا تھا۔ یا جو اب اِسے پڑھیں یا سُنیں لیکن دراصل پوری نوعِ انسانی اس کی مخاطب ہے۔ تمام انسان جو اول روز آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے ہیں وہ آخر کار تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے

دائیں بازو والے[۵۵]، سو دائیں بازو والوں (کی خوش نصیبی) کا کیا کہنا۔
اور بائیں بازو والے[۵۶]، تو بائیں بازو والوں (کی بدنصیبی) کا کیا ٹھکانا۔
اور آگے والے تو پھر آگے والے ہی ہیں[۵۷]، وہی تو مقرب لوگ ہیں۔ نعمت بھری جنتوں میں رہیں گے۔ اگلوں میں سے بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے کم[۵۸]۔ مرصع تختوں پر تکیے لگائے آمنے سامنے بیٹھیں گے۔ انکی مجلسوں

---

۵۵ اصل میں لفظ اصحاب المیمنہ استعمال ہوا ہے۔ میمنہ عربی قاعدے کے مطابق یمین سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی سیدھے ہاتھ کے ہیں اور یُمن سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی ہیں فالِ نیک۔ اگر اس کو یمین سے ماخوذ مانا جائے تو اصحاب المیمنہ کے معنی ہوں گے "سیدھے ہاتھ والے"۔ لیکن اس سے لغوی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ اس کا مطلب ہے، عالی مرتبہ لوگ۔ اہلِ عرب سیدھے ہاتھ کو قوت اور رفعت اور عزت کا نشان سمجھتے تھے جس کا احترام مقصود ہوتا تھا اُسے مجلس میں سیدھے ہاتھ پر بٹھاتے تھے۔ کسی کے متعلق یہ کہنا ہوتا کہ میرے دل میں اس کی بڑی عزت ہے تو کہتے فلانٌ مِنّی بالیمین "وہ تو میرے ہاتھ کی طرف ہے"۔ اُردو میں بھی کسی شخص کو کسی بڑی ہستی کا دست راست اس معنی میں کہا جاتا ہے کہ وہ اُس کا خاص آدمی ہے۔ اور اگر اس کو یُمن سے ماخوذ مانا جائے تو اصحاب المیمنہ کے معنی ہوں گے خوش نصیب اور نیک بخت لوگ۔

۵۶ اصل میں لفظ اصحاب المشئمہ، شُؤم سے ہے جس کے معنی بدبختی، نحوست اور بدفالی کے ہیں اور عربی زبان میں بائیں ہاتھ کو بھی شُؤمیٰ کہا جاتا ہے۔ اُردو میں شومئی قسمت اسی لفظ سے ماخوذ ہے۔ اہلِ عرب شمال (بائیں ہاتھ) اور شُؤم (فالِ بد) کو ہم معنی سمجھتے تھے۔ ان کے یہاں بایاں ہاتھ کمزوری اور ذلت کا نشان تھا۔ سفر کو جاتے ہوئے اگر پرندہ اُڑ کر بائیں ہاتھ کی طرف جاتا تو وہ اس کو بُری فال سمجھتے تھے۔ کسی کو اپنے بائیں ہاتھ بٹھاتے تو اس کے معنی یہ تھے کہ وہ اسے کمتر درجے کا آدمی سمجھتے ہیں۔ کسی کے متعلق یہ کہنا ہو کہ میرے یہاں اس کی کوئی عزت نہیں تو کہا جاتا کہ فلانٌ منی بالشمال۔ "وہ میرے بائیں ہاتھ کی طرف ہے"۔ اُردو میں بھی کسی کام کو بہت ہلکا اور آسان قرار دینا ہو تو کہا جاتا ہے یہ میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ پس اصحاب المشئمہ سے مراد ہیں بدبخت لوگ، یا وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے یہاں ذلت سے دوچار ہوں گے اور دربارِ الٰہی میں بائیں طرف کھڑے کئے جائیں گے۔

۵۷ سابقین (آگے والوں) سے مراد وہ لوگ ہیں جو نیکی اور حق پرستی میں سب پر سبقت لے گئے ہوں، بھلائی کے ہر کام میں سب سے آگے ہوں، خدا اور رسول کی پکار پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے ہوں، جہاد کا معاملہ ہو یا انفاق فی سبیل اللہ کا یا خدمتِ خلق کا یا دعوتِ خیر اور تبلیغِ حق کا۔ غرض دنیا میں بھلائی پھیلانے اور بُرائی مٹانے کے لئے ایثار و قربانی اور محنت و جانفشانی کا جو موقع بھی پیش آئے اس میں وہی آگے بڑھ کر کام کرنے والے ہوں۔ اس بنا پر آخرت میں بھی سب سے آگے وہی رکھے جائیں گے۔ گویا وہاں اللہ تعالیٰ کے دربار کا نقشہ یہ ہوگا کہ دائیں بازو میں صالحین، بائیں بازو میں فاسقین اور سب سے آگے بارگاہِ خداوندی کے قریب سابقین۔ حدیث میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے پوچھا "جانتے ہو قیامت کے روز کون لوگ سب سے پہلے پہنچکر اللہ کے سائے میں جگہ پائیں گے؟" لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتا ہے۔ فرمایا۔ الذین اذا اعطوا الحق قبلوہ، واذا سئلوہ بذلوہ، وحکموا الناس کحکمھم لانفسھم۔ "وہ جن کا حال یہ تھا کہ جب ان کے آگے حق پیش کیا گیا انھوں نے قبول کر لیا۔ جب ان سے حق مانگا گیا انھوں نے ادا کر دیا اور دوسروں کے معاملے میں ان کا فیصلہ وہی کچھ تھا جو خود اپنی ذات کے معاملے میں تھا"۔ (مسند احمد)

۵۸ مفسرین کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے کہ اوّلین اور آخرین یعنی اگلوں اور (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

میں اَبدی لڑکے[۹] شرابِ چشمۂ جاری سے لبریز پیالے اور کنٹر اور ساغر لئے دوڑتے پھرتے ہوں گے جسے پی کر نہ اُن کا سر چکرائے گا نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا۔[۱۰] اور وہ ان کے سامنے طرح طرح کے لذیذ پھل پیش کریں گے کہ جسے چاہیں چُن لیں اور پرندوں کے گوشت پیش کریں گے کہ جس پرندے کا چاہیں استعمال کریں[۱۱] اور ان کے لئے خوبصورت آنکھوں والی حوریں ہوں گی۔ ایسی حسین جیسے چھپا کر رکھے ہوئے موتی[۱۲]۔ یہ سب کچھ اُن اعمال کی جزا کے طور پر انھیں ملے گا جو وہ دنیا میں کرتے رہے تھے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) پچھلوں سے مراد کون ہیں۔ ایک گروہ کا خیال ہے کہ آدم علیہ السلام کے وقت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک جتنی اُمتیں گذری ہیں وہ اولین ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد قیامت کے لوگ آخرین ہیں۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ بعثتِ محمدیؐ سے پہلے ہزارہا برس کے دوران میں جتنے انسان گذرے ہیں اُن کے سابقین کی تعداد زیادہ ہوگی اور حضورؐ کی بعثت کے بعد سے قیامت تک آنے والے انسانوں میں سے جو لوگ سابقین کا مرتبہ پائیں گے اُن کی تعداد کم ہوگی۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہاں اوّلین و آخرین سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے اوّلین و آخرین ہیں۔ یعنی آپکی امت میں ابتدائی دَور کے لوگ اولین ہیں جن میں سابقین کی تعداد زیادہ ہوگی اور بعد کے لوگ آخرین ہیں جن میں سابقین کی تعداد کم ہوگی۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ اس سے مراد ہر نبی کی امت کے اوّلین و آخرین ہیں۔ یعنی ہر نبی کے ابتدائی پیرووں میں سابقین بہت ہوں گے اور بعد کے آنے والوں میں وہ کم پائے جائیں گے۔ آیت کے الفاظ ان تینوں مفہوموں کے حامل ہیں اور بعید نہیں کہ یہ تینوں ہی صحیح ہوں۔ کیونکہ درحقیقت ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اِن کے علاوہ ایک اور مطلب بھی ان الفاظ سے نکلتا ہے اور وہ بھی صحیح ہے کہ ہر پہلے دَور میں انسانی آبادی کے اندر سابقین کا تناسب زیادہ ہوگا اور بعد کے دَور میں ان کا تناسب کم نکلیگا۔ اس لئے کہ انسانی آبادی جس رفتار سے بڑھتی ہے، سبقت فی الخیرات کرنے والوں کی تعداد اُسی رفتار سے نہیں بڑھتی۔ گنتی کے اعتبار سے یہ لوگ چاہے پہلے دَور کے سابقین سے تعداد میں زیادہ ہوں لیکن بحیثیت مجموعی دنیا کی آبادی کے مقابلے میں ان کا تناسب گھٹتا ہی چلا جاتا ہے۔

۹ اس سے مراد ہیں ایسے لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رہیں گے۔ اُن کی عمر ہمیشہ ایک ہی حالت پر ٹھیری رہے گی۔ حضرت علیؓ اور حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ یہ اہلِ دنیا کے وہ بچے ہیں جو بالغ ہونے سے پہلے مر گئے۔ اس لئے نہ ان کی کچھ نیکیاں ہوں گی کہ ان کی جزا پائیں اور نہ بدیاں ہوں گی کہ ان کی سزا پائیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ اس سے مُراد صرف وہی اہلِ دنیا ہو سکتے ہیں جن کو جنّت نصیب نہ ہوئی ہو۔ رہے مومنین صالحین تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں یہ ضمانت دی ہے کہ اُن کی ذرّیت اُن کے ساتھ جنت میں لا ملائی جائے گی (الطور، آیت ۲۱) اسی کی تائید اُس حدیث سے ہوتی ہے جو ابوداؤد طیالسی، طبرانی اور بزّار نے حضرت انسؓ اور حضرت سَمُرہ بن جُندُب سے نقل کی ہے۔ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مشرکین کے بچے اہلِ جنّت کے خادم ہوں گے۔ (مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ صافات، حاشیہ ۲۶۔ الطور، حاشیہ ۱۹)

۱۰ تشریح کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ صافات، حاشیہ ۲۷۔ سورۂ محمد، حاشیہ ۲۲۔ الطور، حاشیہ ۱۸۔

۱۱ تشریح کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ طور، حاشیہ ۱۷

۱۲ تشریح کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ صافات حاشیہ ۲۸، ۲۹۔ الدخان، حاشیہ ۴۲۔ الرحمٰن، حاشیہ ۵۱

* * * * * *

وہاں وہ کوئی بیہودہ کلام یا گناہ کی بات نہ سنیں گے[۱۳]۔ جو بات بھی ہوگی ٹھیک ہوگی[۱۴]۔
اور دائیں بازو والے دائیں بازو والوں کی خوش نصیبی کا کیا کہنا۔ وہ بے خار بیریوں[۱۵] اور تہ بر تہ چڑھے ہوئے کیلوں اور دور تک پھیلی ہوئی چھاؤں اور ہر دم رواں پانی اور کبھی ختم نہ ہونے والے اور بے روک ٹوک ملنے والے بکثرت پھلوں[۱۶] اور اونچی نشست گاہوں میں ہوں گے۔ ان کی بیویوں کو ہم خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے۔ اور انھیں پاکیزہ بنا دیں گے[۱۷]۔

---

۱۳ جنت کی بڑی نعمتوں میں سے ایک ہے جسے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے کہ انسان کے کان وہاں بیہودگی، یاوہ گوئی، جھوٹ، غیبت، چغلی، بہتان، گالی، لاف وگزاف، طنز وتمسخر اور طعن وتشنیع کی باتیں سننے سے محفوظ ہوں گے۔ وہ بدزبان اور بدتمیز لوگوں کی سوسائٹی نہ ہوگی جس میں لوگ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالیں۔ وہ شریف اور مہذب لوگوں کا معاشرہ ہوگا جس کے اندر یہ لغویات ناپید ہوں گی۔ اگر کسی شخص کو اللہ نے کچھ بھی شائستگی اور مذاقِ سلیم سے نوازا ہو تو وہ اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ دنیوی زندگی کا یہ کتنا بڑا عذاب ہے جس سے انسان کو جنت میں نجات پانے کی امید دلائی گئی ہے۔

۱۴ اصل الفاظ ہیں الّا قیلاً سلاماً سلاماً۔ بعض مفسرین ومترجمین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ وہاں ہر طرف سلام سلام ہی کی آوازیں سننے میں آئیں گی۔ لیکن صحیح بات یہ ہے کہ اس سے مراد ہے قولِ سلیم، یعنی ایسی گفتگو جو عیوب کلام سے پاک ہو جس میں وہ خرابیاں نہ ہوں جو پچھلے فقرے میں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں سلام کا لفظ قریب قریب اسی مفہوم میں استعمال کیا گیا جس کے لئے انگریزی میں لفظ SANE استعمال ہوتا ہے۔

۱۵ یعنی ایسی بیریاں جن کے درختوں میں کانٹے نہ ہوں گے۔ ایک شخص تعجب کا اظہار کر سکتا ہے کہ بیر ایسا کونسا نفیس پھل ہے جس کے جنت میں ہونے کی خوش خبری سنائی جائے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ جنت کے بیروں کا تو کیا ذکر، خود اس دنیا کے بھی بعض علاقوں میں یہ پھل اتنا لذیذ، خوشبودار اور میٹھا ہوتا ہے کہ ایک دفعہ منہ کو لگنے کے بعد اسے چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے اور بیر جتنے اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں، ان کے درختوں میں کانٹے اتنے ہی کم ہوتے ہیں۔ اسی لئے جنت کے بیروں کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ ان کے درخت بالکل ہی کانٹوں سے خالی ہوں گے۔ یعنی ایسی بہترین قسم کے ہوں گے جو دنیا میں نہیں پائی جاتی۔

۱۶ اصل الفاظ ہیں لَا مَقْطُوْعَةٌ وَّلَا مَمْنُوْعَةٌ۔ لا مقطوعہ سے مراد یہ ہے کہ یہ پھل نہ موسمی ہوں گے کہ موسم گذر جانے کے بعد وہ نہ مل سکیں، نہ ان کی پیداوار کا سلسلہ کبھی منقطع ہوگا کہ کسی باغ کے سارے پھل اگر توڑ لئے جائیں تو ایک مدت تک وہ بے ثمر رہ جائے، بلکہ ہر پھل وہاں ہر موسم میں ملے گا اور خواہ کتنا ہی کھایا جائے لگاتار پیدا ہوتا چلا جائیگا اور لا ممنوعہ کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے باغوں کی طرح وہاں کوئی روک ٹوک نہ ہوگی۔ نہ پھلوں کے توڑنے اور کھانے میں کوئی امر مانع ہوگا کہ درختوں پر کانٹے ہونے یا زیادہ بلندی پر ہونے کی وجہ سے توڑنے میں کوئی زحمت پیش آئے۔

۱۷ اس سے مراد دنیا کی وہ نیک خواتین ہیں جو اپنے ایمان وعمل صالح کی بنا پر جنت میں جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو وہاں جوان بنا دے گا۔ خواہ وہ کتنی ہی بوڑھی ہو کر مری ہوں۔ نہایت خوبصورت بنا دے گا۔ خواہ دنیا میں وہ حسین ہی ہوں یا نہ رہی ہوں باکرہ بنا دے گا، خواہ دنیا میں وہ کنواری مری ہوں یا بال بچوں والی ہو کر۔ ان کے شوہر بھی اگر ان کیساتھ جنت میں پہنچیں گے تو وہ ان سے ملا دی جائیں گی، ورنہ اللہ تعالیٰ کسی اور جنتی سے ان کو بیاہ دے گا۔ (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

اپنے شوہروں کی عاشق[۱۸] اور عمر میں ہم سن[۱۹] یہ کچھ دائیں بازو والوں کے لئے ہے۔ وہ اگلوں میں سے بھی بہت ہوں گے اور پچھلوں میں سے بھی بہت ع

اور بائیں بازو والے، بائیں بازو والوں کی بدنصیبی کا کیا پوچھنا۔ وہ لُو کی لپٹ اور کھولتے ہوئے پانی اور کالے دھوئیں کے سائے میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہو گا نہ آرام دہ۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جو اس انجام کو پہنچنے سے پہلے خوشحال تھے اور گناہِ عظیم پر اصرار کرتے تھے[۲۰] کہتے تھے "کیا جب ہم مر کر خاک ہو جائیں گے اور ہڈیوں کا پنجر رہ جائیں گے۔

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) اس آیت کی یہی تشریح متعدد احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ شمائل ترمذی میں روایت ہے کہ ایک بڑھیا نے حضورؐ سے عرض کیا میرے حق میں جنت کی دعا فرمائیں۔ آپؐ نے فرمایا جنت میں کوئی بڑھیا داخل نہ ہو گی۔ وہ روتی ہوئی واپس چلی گئی تو آپؐ نے لوگوں سے فرمایا کہ "اُسے بتاؤ وہ بڑھاپے کی حالت میں داخلِ جنت نہیں ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم انھیں خاص طور پر نئے سرے سے پیدا کریں گے اور باکرہ بنا دیں گے۔" ابن ابی حاتم نے حضرت سلمہ بن یزید کی یہ روایت نقل کی ہے کہ میں نے اس آیت کی تشریح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا "اس سے مراد دنیا کی عورتیں ہیں خواہ وہ باکرہ مری ہوں یا شادی شدہ۔" طبرانی میں حضرت ام سلمہ کی ایک طویل روایت ہے جس میں وہ جنت کی عورتوں کے متعلق قرآن مجید کے مختلف مقامات کا مطلب حضورؐ سے دریافت فرماتی ہیں۔ اس سلسلے میں حضورؐ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ھنّ اللواتی قبضن فی دار الدنیا عجائز رمصا شمطا خلقھن اللہ بعد الکبر فجعلھن عذارا ترابا۔ "یہ وہ عورتیں ہیں جو دنیا کی زندگی میں مری ہیں۔ بوڑھی پھونس، آنکھوں میں چیڑ، سر کے بال سفید۔ اس بڑھاپے کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو پھر سے باکرہ پیدا کر دے گا۔" حضرت ام سلمہ پوچھتی ہیں کہ اگر کسی عورت کے دنیا میں کئی شوہر رہ چکے ہوں اور وہ سب جنت میں جائیں تو وہ ان میں کس کو ملے گی؟ حضورؐ فرماتے ہیں انھا تخیّر فتختار احسنھم خلقا فتقول یا رب ان ھذا کان احسن خلقا معی فزوجنیھا، یا ام سلمہ، ذھب حسن الخلق بخیر الدنیا والآخرۃ۔ "اس کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ جسے چاہے چن لے اور وہ اس شخص کو چنے گی جو ان میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق کا تھا وہ اللہ تعالیٰ سے عرض کرے گی کہ اے رب، اس کا برتاؤ میرے ساتھ سب سے اچھا تھا اس لئے مجھے اسی کی بیوی بنا دے۔ اے ام سلمہ، حسنِ اخلاق دنیا اور آخرت کی ساری بھلائی لوٹ لے گیا ہے۔" (مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ رحمٰن، حاشیہ ۵۱)۔

۱۸ اصل میں لفظ عُرُبًا استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ عربی زبان میں عورت کی بہترین نسوانی خوبیوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس سے مُراد ایسی عورت ہے جو طرح دار ہو، خوش اطوار ہو، خوش گفتار ہو، نسوانی جذبات سے لبریز ہو، اپنے شوہر کو دل و جان سے چاہتی ہو، اور اس کا شوہر بھی اس کا عاشق ہو۔

۱۹ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اپنے شوہروں کی ہم سن ہوں گی۔ دوسرا یہ کہ وہ آپس میں ہم سن ہوں گی۔ یعنی تمام جنتی عورتیں ایک ہی عمر کی ہوں گی اور ہمیشہ ایک ہی عمر کی رہیں گی۔ بعید نہیں کہ یہ دونوں ہی باتیں بیک وقت صحیح ہوں، یعنی یہ خواتین خود بھی ہم سن ہوں اور ان کے شوہر بھی ان کے ہم سن بنا دیئے جائیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ یدخل اھل الجنۃ الجنۃ جردا مردا بیضا جعادا مکحلین ابناء ثلاث وثلاثین "اہلِ جنت جب جنت میں داخل ہوں گے تو ان کے جسم بالوں سے صاف ہوں گے۔ مسیں بھیگ رہی ہو گی مگر داڑھی نہ نکلی ہو گی۔ گورے چٹے ہوں گے، گٹھے ہوئے بدن ہوں گے۔ آنکھیں سرمگیں ہوں گی۔ سب کی عمریں ۳۳ سال کی ہوں گی۔" (مُسند احمد، مرویات ابی ہریرہ) قریب قریب یہی مضمون ترمذی میں حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابو سعید خدریؓ سے بھی مروی ہے۔ (بقیہ ۲۰ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

تو پھر اُٹھا کھڑے کئے جائیں گے؟ اور کیا ہمارے وہ باپ دادا بھی اُٹھائے جائیں گے جو پہلے گذر چکے ہیں؟" اے نبی ۔ ان لوگوں سے کہو، یقیناً اگلے اور پچھلے سب ایک دن ضرور جمع کئے جانے والے ہیں جس کا وقت مقرر کیا جا چکا ہے۔ پھر اے گمراہو اور جھٹلانے والو، تم شجر زقوم[۵۲۱] کی غذا کھانے والے ہو۔ اُسی سے تم پیٹ بھرو گے اور اُوپر سے کھولتا ہوا پانی تو پئے لگے ہوئے اونٹ کی طرح پیو گے۔ یہ ہے بائیں بازو والوں کی ضیافت کا سامان روز جزا میں ہم نے تمھیں[۵۲۲] پیدا کیا ہے پھر کیوں تصدیق نہیں کرتے[۵۲۳]؟ (باقی)

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ۵۲۰ یعنی خوش حالی نے ان پر اُلٹا اثر کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے شکر گذار ہونے کے بجائے وہ اُلٹے کافر نعمت ہو گئے تھے۔ اپنی لذاتِ نفس میں منہمک ہو کر خدا کو بھول گئے تھے اور گناہِ عظیم پر مصر تھے "گناہِ عظیم" کا لفظ جامع ہے۔ اس سے مراد کفر و شرک اور دہریت بھی ہے اور اخلاق و اعمال کا ہر بڑا گناہ بھی۔

۵۲۱ زقوم کی تشریح کے لئے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ صافات ۔ حاشیہ ۳۴۔

۵۲۲ یہاں سے آیت ۷۴ تک جو دلائل پیش کئے گئے ہیں ان میں بیک وقت آخرت اور توحید دونوں پر استدلال کیا گیا ہے۔ چونکہ مکہ کے لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے ان دونوں بنیادی اجزاء پر معترض تھے اس لئے یہاں دلائل اس انداز سے دیئے گئے ہیں کہ آخرت کا ثبوت بھی ان سے ملتا ہے اور توحید کی صداقت کا بھی۔

۵۲۳ یعنی اس بات کی تصدیق کہ ہم ہی تمھارے رب اور معبود ہیں اور ہم تمھیں دوبارہ بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

اچھی کتابیں

اسلام اور دورِ جدید — مصنفہ:۔ محمد حسین للّٰہی۔
کیا مذہب اسلام ترقی میں کاوٹ ہے؟ کیا مغربی تحقیقات مستند و مکمل ہیں؟ کیا اس دور میں اسلامی تعلیمات کی ضرورت نہیں؟ یہ اور اسی قسم کے دیگر اہم سوالات کا مشرح جواب۔ ساتھ ہی صحابہؓ، سلف صالحین اور صوفیائے کرام کے کارناموں کو بھی بیان کیا ہے۔ قیمت ـــ دو روپے ۲۵ پیسے۔ ۲/۲۵

چند دن دیارِ غیر میں — مرتبہ:۔ مولانا عبداللہ عباس ندوی ـــ مولانا نے بیروت، روم، لندن اور پیرس میں کیا دیکھا۔ وہاں کی معاشرت اور تہذیب و تمدن کا اصل رنگ دیکھنے کے لئے عمدہ کتاب قیمت صرف ـــ ایک روپیہ ۲۵ پیسے۔ 1/25

سفر مصر و حجاز — مرتبہ:۔ مولانا منت اللہ رحمانی۔
آپ نے مصر و حجاز کا دورہ کیا اور وہاں جو کچھ دیکھا، پوری تفصیل سے اُسے جمع کر دیا۔ دسیوں تصاویر سے مزین یہ سفر نامہ بڑے کام کی چیز بن گئی۔
قیمت ـــ دو روپے ۵۰ پیسے۔

تفسیر بیان السبحان (اردو) — مفسر مولانا سید عبدالدائم جلالی ـــ چالیس سال کی محنت شاقہ سے مرتب کی ہوئی تفسیر۔ جو بیحد آسان زبان میں لکھی گئی۔ ترجمہ سلیس بامحاورہ اور عام فہم ہے۔ کتابت و طباعت صاف ستھری، کاغذ اچھا۔ فی پارہ ۲/۲۵
(آپ ایک روپیہ بھیج کر اس کا ممبر بھی بن سکتے ہیں۔ ممبر حضرات کو محصول ڈاک فری ہو جاتا ہے)

اعلیٰ حضرت کا دین — بریلویت کی مستند تاریخ، فسادی ملاؤں کے ایمان سوز حالات اور اعلیٰ حضرت خود اپنے فتوے سے کافر۔ ایک لرزہ خیز اور عبرت انگیز کتاب۔ قیمت ـــ ایک روپیہ ۵۰ پیسے 1/5

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

تفہیم حدیث

"حضرت بریدہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے تم کو پہلے قبروں پر جانے سے روک دیا تھا، اب تمھیں اس کی اجازت ہے (یعنی اب قبروں کی زیارت کے لئے جا سکتے ہو) میں نے تم کو منع کر دیا تھا اس بات سے کہ بقرعید کی قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ رکھو۔ اب تم کو اختیار ہے۔ میں نے تم کو روک دیا تھا کہ مشک کے سوا کسی اور برتن میں نبیذ نہ رکھو۔ اب تم دوسرے برتنوں میں بھی رکھ سکتے ہو اور پی سکتے ہو، ہاں مگر کوئی نشہ آور چیز نہ پیو۔"

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کے احکام میں حالات و مصالح کے مطابق تبدیلی کی جا سکتی ہے۔

یہ کوئی بے اصولی نہیں کہ کسی چیز کو مصلحت کی بناء پر منع کیا جائے پھر مصلحت باقی نہ رہے تو اجازت دیدی جائے۔

پہلی بات فرمائی کہ میں نے تمھیں قبروں پر جانے سے روک دیا تھا، اور اب اجازت ہے (حکم نہیں ہے) روکا اس وجہ سے گیا تھا کہ لوگ قریبی زمانہ میں مشرک رہ چکے تھے اور مشرکین کے ہاں قبر پرستی مراسم عبودیت میں نمایاں مقام رکھتی تھی۔ ان کے ہاں بعض بت ایسے تھے جن کی قبریں بنی ہوئی تھیں۔ لات طائف کے قریب ایک شخص تھا جو حاجیوں کی میزبانی اور مسافروں کی خوب تواضع کرتا تھا۔ جاہلیت کے مذہب کے مطابق بڑا نیک سیرت آدمی تھا جب وہ مر گیا تو بعض لوگوں میں مشہور ہو گیا کہ وہ مرا نہیں بلکہ غائب ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس کا نشانِ قبر بنا لیا گیا۔ اس طرح اور بھی بعض مثالیں موجود تھیں۔

آغاز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا تھا۔ بعد میں جب لوگ خوب تربیت یافتہ ہو گئے اور کوئی خطرہ اس چیز کا باقی نہ رہا، تو آپؐ نے اجازت دے دی اور اپنے ایک ارشاد میں زیارت قبور کی غرض یہ بیان فرمائی

کہ اس سے دنیا پرستی سے نکلنے اور آخرت اور موت کو یاد کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

اس سے یہ اصول بھی مستنبط ہوتا ہے کہ فتنہ کے اندیشہ کی بناء پر کسی مباح کام سے روکا جا سکتا ہے اور جب وہ فتنہ باقی نہ رہے تو پھر اس کی اجازت دی جا سکتی ہے (مگر یہ اختیار علمائے امت کو ہے، دوسروں کو نہیں)

دوسری چیز قربانی کا گوشت ہے جس کے متعلق آپؐ نے منع فرما دیا تھا کہ تین دن سے زائد کوئی اسے اپنے پاس نہ رکھے۔

اس زمانے میں مہاجرین مدینہ میں پڑے ہوئے تھے ان کا کوئی گھر بار اور کاروبار نہیں تھا، تو اس مصلحت کی بناء پر حضورؐ نے منع فرما دیا، تاکہ وہ لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ بعد میں جب یہ حالت باقی نہ رہی تو اجازت دیدی گئی کہ اگر کوئی چاہے تو قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ دنوں تک کے لئے بھی ذخیرہ کر سکتا ہے۔

تیسری چیز نبیذ بنانے سے منع فرمایا تھا کہ سوا مشک کے کسی اور برتن میں نہ بنائی جائے۔ انگور اور خرمہ وغیرہ کے فشردہ میں جب تک خمیر نہ اٹھے اور نشہ آور نہ بنے اس وقت تک نبیذ کہلاتا ہے۔

لوگ اس زمانے میں شراب مشک کے بجائے دوسروں برتنوں میں سڑایا کرتے تھے۔ قریب کے زمانے میں لوگ شراب پیتے رہے تھے اور جو شرابی رہ چکا ہو، اس کے سامنے جب شراب کا برتن آجائے تو اس کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس آزمائش سے بچانے کے لئے نبیذ کے لئے ان برتنوں کے استعمال سے منع فرما دیا گیا، جن میں کبھی شراب لی جاتی تھی، یا بنائی جاتی تھی۔

بعد میں جب یہ حالت ختم ہو گئی، تو آپ نے فرمایا کہ وہ خطرہ اب باقی نہیں رہا، یعنی اب نبیذ کے لئے ان برتنوں کے استعمال کی اجازت ہے۔ جو کبھی شراب کے لئے استعمال ہوتے تھے۔

ایک چیز تو بجائے خود ممنوع ہوتی ہے، اس لئے اس سے روکا جاتا ہے اور ایک چیز برائی کی طرف لے جانے کا سبب بنتی ہے۔ اس لئے اس سے بھی روک دیا جاتا ہے۔ اگر وہ سبب باقی نہ رہے، تو حرمت بھی باقی نہ رہے گی۔ یہ ایک اصول ہے جو اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے۔

زیارت قبور کے لئے ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیئے وہ یہ کہ جہاں مشرکانہ رسومات ہوتی ہوں، وہاں نہیں جانا چاہیئے۔ اگر خود کوئی غلط کام وہاں جا کر آدمی نہ بھی کرے تو بھی ان لوگوں کی حوصلہ افزائی ضرور ہوگی اور صحیح الخیال لوگوں میں اس کے متعلق بدگمانی پیدا ہوگی۔

"حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو دن میرے ہاں رہنے کا تھا۔ اس رات آپؐ کا معمول یہ تھا کہ آپ رات کے آخری حصے میں بقیع کی طرف تشریف لے جاتے اور فرماتے کہ اے مومنوں کی بستی والو تم پر سلامتی ہو۔ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا، وہ تم پر آچکی، کل قیامت تک کے لئے تم کو مہلت دی گئی ہے اور ہم تم سے ملنے والے ہیں۔ خدایا مغفرت فرما بقیع غرقد کے رہنے والوں کی۔"

اس حدیث میں بھی دعائے مغفرت اور استحضار موت ہے۔

بقیع میں حضورؐ کے نہایت محبوب صحابہ، جنھوں نے حضورؐ کے ساتھ فداکاری کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا تھا، مدفون تھے۔ حضورؐ کو صحابۂ کرام کے ساتھ جو گہرا قلبی تعلق تھا اس کی بناء پر آپؐ راتوں کو وہاں جاتے اور ان کے لئے دعائے مغفرت فرماتے۔

حضرت عائشہؓ صرف اپنی باری کی رات کا معمول نبویؐ بیان فرماتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دوسری راتوں میں بھی حضورؐ کا یہی معمول

ہوتا ہوگا

حضرت عائشہؓ ہی بیان فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ جب میں قبروں کی زیارت کروں تو کیا کہوں۔ آپؐ نے فرمایا یوں کہو کہ مومنین اور مسلمین کی بستی والوں پر سلامتی ہو، اللہ ہم سے آگے جانے والوں پر بھی رحم فرمائے اور بعد میں آنے والوں پر بھی، اور انشاء اللہ ہم بھی تم سے ضرور ملنے والے ہیں۔"

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں کے لیے زیارت قبور ممنوع اور حرام نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ نے جب اجازت چاہی، تو آپؐ نے منع نہیں فرمایا بلکہ تعلیم فرمائی کہ اگر جاؤ تو وہاں جا کر اس طرح کہو۔

عورتوں کے بارے میں زیارت قبور کی جو بعض احادیث میں مذمت آئی ہے اس سے مراد جزع فزع سے روکنا ہے۔ کیونکہ عورتیں زیادہ صبر نہیں کر سکتیں۔ اور واویلا کرنے لگتی ہیں۔ اگر صبر و سکون کے ساتھ دعائے مغفرت کریں تو مضائقہ نہیں۔

اس حدیث میں بھی اہل قبور کے لئے دعائے مغفرت اور اپنی موت کے استحضار کی تلقین ہے۔

"حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے پہلے تم کو قبروں کی زیارت سے منع کر دیا تھا، اب تم ان کی زیارت کرو۔ کیونکہ وہ دنیا سے بے رغبتی پیدا کرتی ہے اور آخرت یاد دلاتی ہے۔"

اس حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کوئی جائز یا مباح فعل برائی کا ذریعہ بنتا ہو تو عارضی طور پر اس کی اباحت کو ختم کر دیا جائے گا۔ یعنی جن اغراض کے لئے اجازت دی گئی (جن کا اوپر بیان ہو چکا ہے) ان اغراض کے ماسوا اگر ان اغراض کے لئے زیارت کی جانے لگے، جو جاہلیت کی اغراض ہیں، تو یہ اباحت ختم ہو جائے گی۔

"حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی ہے۔"

امام ترمذیؒ لکھتے ہیں کہ بعض اہل علم کا خیال یہ ہے کہ یہ بات اسی زمانے کی ہے۔ جب آپؐ نے ابھی زیارت قبور کی اجازت نہیں دی تھی، جب اجازت دیدی گئی، تو مرد عورتیں دونوں شامل ہو گئے۔ اور بعض اہل علم کا خیال ہے کہ حضورؐ نے قبروں کی زیارت کو عورتوں کے لئے ناپسند اس غرض کے لئے فرمایا کہ وہ صبر نہیں کرتیں اور جزع فزع کرتی ہیں۔

"حضرت عبداللہ بن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کی طرف عامل بنا کر بھیجا (آٹھ نو ہجری کے درمیان حضورؐ نے انھیں یمن کا عامل بنا کر بھیجا اور وہاں حضرت عمرؓ کے زمانہ تک رہے۔ بعد میں حضرت عمرؓ نے انھیں

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

شام کی طرف عامل بنا کر بھیج دیا)
حضورؐ نے انھیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا
کہ تم ایک ایسی قوم کی طرف جا رہے ہو جو اہلِ
کتاب ہیں (وہ لوگ یہود اور عیسائی تھے)
ان کو سب سے پہلے دعوت دینا کہ وہ لاالٰہ الا
اللہ کی شہادت دیں۔ اگر وہ یہ بات مان لیں
تو ان کو بتانا کہ اللہ نے تم پر پانچ وقت کی
نماز فرض کی ہے، اگر یہ بات بھی مان لیں تو
اس کے بعد انھیں بتانا کہ اللہ نے تم پر
صدقہ (زکوٰۃ) فرض کیا ہے (صدقہ اور
زکوٰۃ ہم معنیٰ الفاظ ہیں) اور انھیں یہ بھی بتانا
کہ یہ زکوٰۃ اور صدقہ انہی کے مالداروں سے
لیا جائے گا اور انہی کے فقیروں پر صرف کیا
جائے گا (زکوٰۃ لازماً انہی آٹھ قرآنی مدات میں
صرف کی جائے گی کسی اور مد میں اس کا
استعمال جائز نہیں)

اگر وہ اس بات کو بھی مان لیں تو خبردار
ان کے اعلیٰ درجے کے مال چھانٹ کر نہ لینا
اور مظلوم کی پکار سے بچنا، کیونکہ اس کے اور
خدا کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔

اس روایت سے چند اہم امور معلوم ہوتے ہیں

۱۔ جو شخص ایک اسلامی حکومت کی طرف سے گورنر بنایا جائے اس کا اولین کام خدا کے راستے کی طرف لوگوں کو دعوت دینا ہے۔ یعنی یہ اس کا پہلا کام ہے۔ نظم و نسق ٹیکس کی وصولی اور دیگر انتظامی امور بعد کے کام ہیں۔

یہی فرق ہے اسلامی نظام حکومت اور غیر اسلامی نظام حکومت میں۔ غیر اسلامی حکومت میں گورنر کا بنیادی کام نظم و نسق چلانا ہوتا ہے اور اسلامی حکومت اللہ کا کلمہ دنیا میں بلند کرنے کے لئے قائم ہوتی ہے۔ اس کے سوا دوسرے تمام مقاصد ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اوپر سے نیچے تک ہر کارندے کا پہلا کام خدا کی طرف بلانا ہوتا ہے۔

جس حکومت کا ایک ایک کارندہ اس کام میں لگا ہوا ہو، وہ حکومت کبھی ظالم نہیں ہو سکتی۔ کیا ایک پولیس افسر جو لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دے رہا ہو۔ اس کی زبان سے کبھی گالیاں بھی نکل سکتی ہیں؟ یہ دونوں کام ساتھ ساتھ ناممکن ہیں۔ اسی طرح نیچے سے اوپر تک قیاس کر لیجئے۔ اگر فی الواقع کوئی ایسی حکومت وجود میں آجائے، جس کا پہلا کام مخلوق کو خدا کی طرف دعوت دینا ہو تو وہ حکومت دنیا کو رحمت سے بھر دے گی۔

۲۔ لوگوں کے سامنے دین بیک وقت پورا کا پورا پیش نہیں کر دینا چاہیئے بلکہ پہلے بنیادی باتیں تدریج کے ساتھ پیش کی جائیں۔ تاکہ سمجھنے اور ماننے میں آسانی ہو۔ کوئی شخص اگر اللہ اور اس کے رسول کو مانتا ہی نہ ہو، تو دوسری باتیں اس کے لئے بیکار ہیں۔ اس میں حکمت، تبلیغ بتائی گئی ہے۔

۳۔ کلمہ شہادت کے بعد اولین چیز نماز ہے۔ شاعر نے سچ کہا کہ:-

روزِ محشر کہ جاں گداز بود
اولاً پرسشِ نماز بود

نماز اسلام کا سب سے بڑا ٹیسٹ ہے۔ ایک شخص اسلام لاتا ہے اور کلمۂ شہادت کے تھوڑی ہی دیر بعد نماز کا وقت آجاتا ہے تو نماز ہی یہ بتائے گی کہ وہ خلوص کے ساتھ ایمان لایا ہے یا نہیں۔

دوسری چیز زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ اللہ کی عبادت ہے اور دین کا ستون ہے، اگر اسلامی حکومت موجود نہ ہو تو جس طرح نماز ساقط نہیں ہوتی۔ اس طرح زکوٰۃ بھی ساقط نہیں ہوتی۔

تیرہ چودہ سو برس سے غیر اسلامی حکومتوں میں یہ عبادت سمجھ کر ادا کی جاتی رہی ہے۔ قرآن کو سمجھنے والا کوئی شخص اسے ٹیکس کا ہم معنیٰ قرار نہیں دے سکتا۔ ٹیکس دو اصولوں پر مبنی ہے۔ ایک یہ کہ آپ جو تمدنی سہولتیں اپنے لئے چاہتے ہیں۔ اس میں اپنا حصہ ادا کریں۔ ملک کا دفاع، سڑکیں ریلوے، نہریں، باشندگان ملک کا فریضہ ہے کہ وہ ان اہم ملکی اور قومی ضروریات کے لئے سرمایہ فراہم کریں۔ رضاکارانہ

طور پر چندہ دیں اور قانون کے مطابق ٹیکس ادا کریں۔ ٹیکس کا فلسفہ یہ ہے کہ جب آدمی ان چیزوں سے فائدہ حاصل کرتا ہے تو اسے ان میں اپنا حصہ ادا کرنا چاہیئے۔

دوسرا اصول ٹیکس کا یہ ہے کہ جو جتنی صلاحیت رکھتا ہے اس پر اس کے مطابق عائد ہوگا لیکن اس میں استثناء ہرگز نہیں ہوتا۔ ہر شخص کو بلاواسطہ یا بالواسطہ اس میں اپنا حصہ لازماً ادا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ کے پاس جو ماچس کی ڈبیہ ہے تو آپ نے اسے خریدتے وقت اپنے حصہ کا ٹیکس ادا کر دیا ہے۔

اس کے برعکس زکوٰۃ کا اصول یہ ہے کہ ادا کرنے والے کو اس کا کوئی مادی فائدہ نہیں پہنچتا۔ کوئی سہولت اس کے نتیجے میں اسے فراہم نہ کی جائے گی۔ بلکہ کلیتہً فقراء پر خرچ کر دی جائے گی۔ زکوٰۃ مالداروں سے لے کر فقراء و مساکین پر صرف کی جائے گی، اس کی مالداروں کی طرف پلٹنے کی کوئی شکل نہیں ہے۔

پھر ایک ہدایت حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے عامل کو یہ دی کہ زکوٰۃ کی وصولی کے وقت اگر وہ جانوروں کی صورت میں ہو تو بہتر جانور چھانٹ کر نہ لیا جائے بلکہ اوسط درجے کا مال لیا جائے۔ یہ تو اسلام کی اسپرٹ کا نتیجہ تھا کہ وہ صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ اپنا سب سے اچھا مال زکوٰۃ میں دینے پر اصرار کرتے تھے۔ جب لینے والا انکار کرتا تو اس کی شکایت خلیفۂ وقت سے کی جاتی تھی۔ یعنی دینے والے اچھا مال دینے پر مصر ہیں اور لینے والے چھانٹ کر اچھا مال لینے سے انکاری ہیں اور یہ قضیہ پھر خلیفۃ المسلمین کی خدمت میں پیش ہوتا۔

اس ہدایت کا منشا یہ ہے کہ لینے والا اپنی مرضی سے چھانٹ کر نہ لے۔ ہاں دینے والا اگر اپنی مرضی سے چھانٹ کر دے تو لینے میں مضائقہ نہیں۔

اب ظاہر ہے کہ جس شخص کا زکوٰۃ کی ادائیگی میں یہ رویہ ہو، وہ دوسرے حقوق کیسے ادا نہیں کرے گا۔ یہ اصول حضورؐ نے تعلیم فرمائے ہیں۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عامل کو ہدایت فرمائی کہ مظلوم کی بددعا سے بچو۔ یعنی لوگوں پر زیادتی نہ کی جائے اور بلاوجہ انھیں پریشان نہ کیا جائے۔

"حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ کوئی سونے اور چاندی کا مالک ایسا نہیں ہے کہ اللہ کا حق ادا نہ کرتا ہو اور اس کا انجام یہ نہ ہو کہ جب قیامت کا دن ہوگا اور اللہ کے پاس لایا جائے گا، آگ کا ایک الاؤ تیار کیا جائے گا، اور جہنم کی آگ میں وہ سونا چاندی تپایا جائے گا، پھر اس سے اس کے پہلوؤں، پیشانی اور پیٹھ کو داغا جائے گا۔ یہ کام پچاس ہزار سال تک ہوتا رہے گا، یہاں تک کہ لوگوں کے حساب کتاب کا فیصلہ ہو جائے گا اور وہ اپنا انجام جہنم یا جنت کی طرف دیکھ لے گا۔"

یہ سزا اس کو قیامت کے میدان میں دی جائے گی یعنی دوسرے عقائد و اعمال کی بناء پر اصل سزا تجویز ہونے سے پہلے کہ وہ جنت کا مستحق قرار پاتا ہے یا دوزخ کا، اس وقت تک اس کو یہ سزا دی جاتی رہے گی، ہو سکتا ہے کہ اس مدت میں اس کا حساب صاف ہو جائے اور جہنم سے بچ جائے۔

لوگوں نے پوچھا کہ یا رسول اللہؐ اونٹ والے کا کیا حکم ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں نہ کوئی اونٹ والا ایسا ہے کہ وہ اپنے اونٹوں میں سے اللہ کا حق ادا نہ کرے (یعنی جس روز اونٹوں کو پانی پلانے لے جایا جائے۔ اس روز ان کا دودھ محتاجوں کو پلایا جائے) اور اس کا انجام یہ نہ ہو کہ جب قیامت آئے تو وہ اپنے

اونٹوں کے آگے چلایا جائے گا۔ اور اس کے سارے اونٹ اس پر چڑھائے جائیں گے جو اسے اپنے پیروں کے نیچے کچلیں گے اور یہ کام بھی پچاس ہزار سال تک ہوتا رہے گا۔ (یعنی یہ ایک ایسے دن میں ہوگا، جو پچاس ہزار سال کے برابر ہے) پھر آخر میں جب مقدمات کا فیصلہ ہو جائے گا تو یا وہ اپنا راستہ جہنم کی طرف دیکھے گا یا جنت کی طرف۔

لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گائے اور بکریوں کے مالک کا کیا حکم ہے آپؐ نے ان کے بارے میں بھی یہی بتایا۔ یعنی ان کا حق ادا نہ کرنے کی صورت میں اسے ایک ہموار میدان میں گرایا جائے گا اور گائیں اور بکریاں اسے کچلتی رہیں گی، اور ان کے اندر کوئی بغیر سینگ کے یا سینگ ٹوٹی نہ ہوگی پھر ان لوگوں نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑوں والوں کا کیا حکم ہے آپؐ نے فرمایا۔ گھوڑے تین قسم کے ہیں

۱۔ اپنے مالک کے لئے بوجھ۔
۲۔ مالک کے لئے پردہ۔
۳۔ مالک کے لئے اجر۔

جس کے لئے اس کے گھوڑے بوجھ ہیں۔ وہ ایسا شخص ہے جس کے گھوڑے اسلام کے خلاف سرگرمیوں میں کام آتے ہیں۔ اور جو فخر اور ریا کے طور پر استعمال کئے جائیں ـــــ جس آدمی کے لئے اس کا گھوڑا پردہ ہے وہ ایسا شخص ہے، جس نے اس کو باندھ رکھا ہے اور جہاد کا موقع آنے پر جہاد کے لئے اسے استعمال کیا۔ پردہ سے مراد عذاب سے بچانے والا پردہ۔

امام شافعیؒ کے نزدیک گھوڑوں کا اللہ کی راہ میں کام آنا ہی ان کی زکوٰۃ ہے۔

ایک دوسرے گروہ کے نزدیک گھوڑے تجارت کیلئے ہوں تو تجارت کے نفع پر زکوٰۃ عائد ہوگی۔

ایک اور گروہ کے نزدیک جو گھوڑے افزائش نسل کے لئے ہوں، ان کی زکوٰۃ دوسرے مویشیوں کی طرح ادا کی جائے گی۔

اور وہ شخص جس کے لئے گھوڑا اجر ہے، وہ ایسا شخص ہے جس نے اپنے گھوڑوں کو اسلام کے راستے میں باندھ رکھا ہو، یعنی اسلامی حکومت کی خدمات کے لئے مجاہدین کی خاطر اور اللہ کی راہ میں کام آئیں۔ جس چراگاہ میں وہ چر رہے ہوں، ایک ایک تنکے پر اس کے لئے نیکیاں لکھی جائیں گی۔ حتیٰ کہ ان کی لید اور پیشاب کرنے پر بھی نیکیاں ہوں گی۔ گھوڑے جب بندھنوں سے کھول کر میدان میں دوڑائے جائیں تو ایک ایک قدم پر نیکیاں لکھی جائیں گی اسی طرح سے کسی پانی پینے کی جگہ پر سے گذر رہے ہوں اور وہاں سے پانی پئیں، چاہے بغیر پیاس کے یونہی پی لیں تو پانی کے ہر گھونٹ پر اس کے لئے حسنات ہیں۔

موجودہ زمانے میں فوجی رسالے کے ٹرک اور جیپ وغیرہ کا یہی حکم ہوگا۔

جہاد ایسی اہم چیز ہے کہ جہاد کے لئے جو کام بھی کیا جائے گا، اس پر اجر ملے گا۔

پھر لوگوں نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گدھوں کے بارے میں کیا حکم ہے آپؐ نے فرمایا کہ ان کے بارے میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ البتہ آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی من یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ۔ جو ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا قیامت کے روز اسے دیکھ لے گا۔ یعنی حضورؐ نے یہ اصول بیان فرما دیا۔

تنبیہ

سُرمہ دُرِّ نجف کے متعلّق

جب آپ بازار سے دُرِّ نجف خریدیں تو اچھی طرح پڑھ لیں کہ یہ "درنجف" ہی ہے یا کوئی سرمہ اور یہ بھی دیکھ لیں کہ اس پر دارالفیض رحمانی دیوبند ہی کا پتہ چھپا ہوا ہے یا نہیں۔ "دُرِّ نجف" کی شہرت و مقبولیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کیلئے بہتیرے سرمے اسی سے ملتے جلتے ناموں کے ایجاد کرلئے گئے ہیں جن کے لیبل اور پیکنگ کو پوری طرح "دُرِّ نجف" کے مشابہ بنا دیا گیا ہے۔

ادارہ جلد ایسے پلاسٹک خول تیار کرا رہا ہے کہ جن کی ساخت ہی میں "درنجف" اور "دارالفیض رحمانی" لکھا ہوا ہوگا۔ لیکن جبتک موجودہ پیکنگ چل رہا ہے اس وقت تک آپ خصوصی نظر رکھیں۔ ورنہ "درنجف" کے دھوکے میں کوئی اور سرمہ خرید بیٹھے تو ظاہر ہے کہ یہ پیسے برباد جائیں گے۔

منیجر

دارالفیض رحمانی۔ دیوبند

بھول جائیے گرمی،
یاد رکھیے
رُوح افزا

گرمیوں کا ایک ہی مشروب
جو پیاس بجھاتا ہے،
اعصاب کو تسکین دیتا ہے
اور گرمی سے بچاتا ہے۔

شربت رُوح افزا

HDR-4855-A.U

رگوں میں صحت مند خون ہو تو چہرے کھل اُٹھتے ہیں

چہروں کی کملاہٹ خون کی خرابی کا پتہ دیتی ہے
خون کی خرابی نظامِ جسم کے خلل کا اشارہ ہے

صاف اور نکھری جلد اور صحت مند خون کے لیے

صافی

استعمال کیجیے

صافی
خون صاف کرنے کی قدرتی دوا

ہمدرد

HDS-4861-U

تجلّی کی ڈاک

خاندانی منصوبہ بندی

اب تک ہماری روش ان صفحات میں یہ رہی ہے کہ عنوان کے متصل بعد خود سائل کی عبارت دیتے ہیں مگر اس وقت ہمیں ایک فتویٰ نقل کر کے اس پر نقد کرنا ہے اسلئے سائل کا پورا سوال ان کے اپنے الفاظ میں نقل کرنے کے بجائے ہم خود اپنے الفاظ میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شہر حیدرآباد میں ایک کل ہند صنعتی نمائش ہر سال لگتی ہے اور مکتوب نگار کی اطلاع کے مطابق یہ اس سال بھی لگی۔ مکتوب ۲۳ جنوری ۶۸ء کا لکھا ہوا ہے اسلئے اس سال سے مراد ۶۸ء ہی ہوگی۔ اس طرح کی نمائشوں میں حکومت کی طرف سے مختلف شعبوں کی کارگذاریوں سے متعلق اسٹال لگائے جاتے ہیں۔ اس سال دوسرے اسٹالوں کے پہلو بہ پہلو فیملی پلاننگ کا بھی اسٹال لگا جس میں نقشوں، چارٹوں اور اعداد و شمار کی مدد سے "بچے کم پیدا کرو" کی تلقین کی گئی۔

یہاں تک تو خیر کوئی قابل ذکر بات نہ تھی لیکن مکتوب نگار اطلاع دیتے ہیں کہ اسٹال پر جامع مسجد دہلی کے نائب امام جناب سید عبداللہ بخاری کا قدِ آدم فوٹو بھی آویزاں تھا اور ان کا ایک مطبوعہ فتویٰ بڑے پیمانے پر تقسیم کیا جا رہا تھا۔ یہ فتویٰ بھی موصوف نے ہمیں ارسال کیا ہے اور اسی کا جائزہ لینا اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔

جہاں تک حکومتِ وقت کے نظریات و مقاصد کا تعلق ہے اس پر ہمیں کچھ کہنا نہیں۔ ایک بے خدا حکومت کے اربابِ حل و عقد سے یہ توقع کی ہی نہیں جا سکتی کہ وہ اپنی پالیسیوں اور پروگراموں کی وضع میں اخلاقی اصول و اقدار کو کوئی قابل ذکر اہمیت دیں گے۔ اگر ان اربابِ حل و عقد میں کچھ لوگ اپنی ذاتی حیثیت میں اخلاق و روحانیت کے ماننے والے ہیں بھی تو یہ ماننا نسلی اور ذاتی عقیدت مندی سے آگے نہیں بڑھتا۔ لہٰذا ان کا طرزِ فکر ٹھیٹ مادیت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہونا ہی چاہیئے۔

مگر کہنا ان بزرگوار کے بارے میں ہے جو خدا اور رسول پر ایمان کا دعویٰ رکھنے کے باوجود ایک ایسے

مشن کے فروغ میں تعاون دے رہے ہیں جس کی فکری جڑیں خالص ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نظریات میں ہیں اور جس کا ذہنی محور خدا کی رزّاقی کے بجائے انسان کی رزّاقی کا باطل تصور ہے۔

گو کہ سیّد عبداللہ بخاری جیسے فتویٰ نویسوں کا کوئی مقام علمی و دینی حلقوں میں نہیں اور معمولی سی واقفیت اور شدہ بدہ رکھنے والے عوام بھی جانتے ہیں کہ ایسے کم عیار لوگوں کا فتویٰ کسی مندر یا کلیسا میں گائے جانے والے اس راگ سے مختلف نہیں جسے اذان کے لحن میں گا کر یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہو کہ آجاؤ نماز تیار ہے۔ لیکن علم کی کمی اور ماحول کے بگاڑ کی وجہ سے بہتیرے علاقوں کے مسلم عوام ایسی نازک پوزیشن میں آچکے ہیں کہ بھونڈے سے بھونڈا فریب بھی انھیں بآسانی شکار کر سکتا ہے اور چونکہ اپنی بے علمی اور بے خبری کے باوجود اللہ کے فضل سے مذہب سے ایک روحانی تعلق اور علمائے دین کی عقیدت ان کے اندر موجود ہے اس لئے جبہ و دستار اور ریش و عصا کا میک اپ ان کی سادہ لوحی کو دھوکہ دے جائے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہ ہوگی لہٰذا ہم نے بھی اپنے آپکو بادلِ ناخواستہ اس ارذل کام پر آمادہ کر لیا ہے کہ سید عبداللہ صاحب کے اس فتوے پر کلام کریں جو اگرچہ اپنی علمی و فقہی حیثیت سے ایک لایعنی شے ہے لیکن جسے سیّد صاحب موصوف کی سرپرست حکومت بڑے پیمانے پر چھاپ کر مسلم عوام میں تقسیم کر رہی ہے۔

ابھی اکتوبر ۶۷ء کے تجلی میں "تجلی کی ڈاک" کے تحت اس فتوے کا اجمالی ذکر آیا بھی تھا اور ہم نے "خاندانی منصوبہ بندی" کا عنوان دے کر سرسری سا اظہار خیال بھی کیا تھا، مگر آج یہ فتویٰ اپنی مکمل شکل میں ہمارے سامنے ہے جس کے پمفلٹ ایک سے زیادہ حضرات نے ہمارے پاس یہی لکھ کر بھیجے ہیں کہ عوام کی رہنمائی کے لئے اس پر نقد کیا جائے۔ یہ پمفلٹ اتنے بڑے پیمانے پر تقسیم ہو رہے ہیں کہ ایک ہی صوبے کے مختلف اضلاع سے ان کی جو کاپیاں ہمارے پاس آئی ہیں وہ عبارت کے اعتبار سے اگرچہ ایک دوسرے کی نقل ہیں مگر طباعت و کتابت کے لحاظ ایک دوسرے کا مثنیٰ نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مختلف اضلاع کی پروپیگنڈہ مشینری اسے اپنے اپنے طور پر چھاپ کر تقسیم کر رہی ہے۔ مزید یہ کہ اس کا دائرہ فقط ایک صوبے تک محدود نہیں ہے بلکہ جہاں آندھرا پردیش (علاقۂ حیدرآباد) میں اسے اشاعت دی جارہی ہے وہیں فریدآباد کے گورنمنٹ آف انڈیا پریس نے بھی اسے چھاپا ہے۔ اس کے چھاپے ہوئے پمفلٹ کی پیشانی پر سیّد صاحب کی بڑی سی تصویر ہے اور پشت کی طرف انگریزی میں فیملی پلاننگ کا پروپیگنڈہ ہے جس کے ماتھے پر سکھ لیڈر سنت فتح سنگھ کا فوٹو دیا گیا ہے۔

یہ تفصیل ہم نے بے خبر برادرانِ اسلام کو اس پہلو کی طرف متوجہ کرنے کے لئے پیش کی کہ یہ فتویٰ حکومت کی طلب پر دیا ہوا فتویٰ ہے جو اگر دلائل شرعیہ پر بھی مشتمل ہوتا تب بھی اس کی روح، روحِ شیطانی ہی کہلاتی۔ مگر اس میں تو دلائل نام کی بھی کوئی چیز نہیں بلکہ ایسے غیر علمی چٹکلے ہیں جن پر علمی رخ سے کچھ کہنا ہی مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی ہم اپنے اصلاحی مقاصد اور حمایتِ دین کے نقطۂ نظر سے اس مضحکہ خیز پوزیشن کو قبول کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمارے دینی بھائیوں کو شیطانی فلسفوں اور گمراہ کن منصوبوں کا شکار ہونے سے بچا۔

لیجئے پہلے آپ پورا فتویٰ جوں کا توں پڑھ لیجئے تاکہ آج کی گفتگو پوری طرح آپ کی سمجھ میں آجائے۔ نقل مطابق اصل پیش خدمت ہے۔

نقل فتویٰ

"مجھے فیملی پلاننگ کے مسئلے سے واقعی دلچسپی ہے میں چونکہ دہلی کی جامع مسجد کا نائب امام ہوں اور میری زندگی کا عنوان اول مذہب ہے۔ اس لئے

میں مختصر الفاظ میں ضبط تولید کے مسئلے پر مذہبی نقطہ نگاہ سے کچھ روشنی ڈالوں گا۔

اس میں شک نہیں کہ اب سے چند سال قبل تک یہ مسئلہ انفرادی حیثیت رکھتا تھا اور چنداں اس کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی۔ لیکن آج صورت حال یہ ہے کہ اب یہ مسئلہ ملکی ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی بن گیا ہے اور بین الاقوامی بھی ایسا کہ دنیا کے تقریباً ہر ملک میں اضافہ آبادی کے مسئلے پر تشویش ہے۔ اس وقت عام دنیا کے ماہرین کہ جو اس خاص مسئلے سے تعلق رکھنے میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ اس بڑھتی ہوئی آبادی کے انسداد اور روک کے لئے غور و فکر میں منہمک ہیں اور اس کے عملی پہلوؤں کے خاکے مرتب کرنے میں دن رات مصروف ہیں۔ ہمارا ملک ہندوستان اس خطرناک اور پریشان کن مسئلے کی صف اول میں آتا ہے۔ ہمارے ملک کی آبادی اس خوفناک حد تک بڑھ گئی ہے کہ روزانہ ۵۵ ہزار نومولود مہمان کا ایک نیا شہر آباد ہو جاتا ہے۔ اس وقت تمام ملک کی آبادی ۵۱ کروڑ کے لگ بھگ ہے اور اس میں روزانہ ۵۵ ہزار مہمانوں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ زمین اتنی ہی ہے اور زمین آ نہیں سکتی۔ ایک مکان جس میں دس آدمی ٹھیر سکتے ہیں اچانک اس مکان میں سو مہمان آجائیں تو ان کو آپ کہاں رکھیں گے۔ یقیناً یہ مسئلہ آپ کو پریشان کر دے گا۔

آمدنی ایک بچے کے گذارے کے لائق ہو اور بچے دس ہوں تو کیسے گذارہ ہوگا۔ یقیناً یہ ایسے مسائل ہیں کہ آپ کی زندگی کو گھلا کر رکھ دینگے اور آپ کی جان کو جیتے جی کرم (کیڑا) کھا جائیگا حکومت کے لئے تو تمام ملک کا مسئلہ ہے۔ کروڑہا کروڑ انسانوں کی غذا، ان کی آبادکاری، ان کی تعلیم اور ان کے اچھے شہری بننے کا مسئلہ ہے۔ کہاں سے وہ ان ضروریات کو پورا کر سکتی ہے۔ غذا کا انتظام غیر ملکوں سے کیا جاتا ہے۔ آخر یہ بھی کب تک ہوتا رہے گا۔ رہی آبادکاری تو اس کے لئے زمین تو امپورٹ نہیں کی جا سکتی۔

یہ ہیں وہ مسائل کہ جن پر آج ہمیں بہت ٹھنڈے دل سے غور کرنا ہے اور اس پر عمل کرنا ہے اور دوسروں سے عمل کروانا ہے۔

اولاد کم سے کم پیدا ہو، ضروری وجوہات کے ماتحت اسلام ضبط تولید اور فیملی پلاننگ کی اجازت دیتا ہے۔ اور اس نے اس کے لئے چند اصول وضع کئے ہیں۔

میں دنیا کے اکثر ملکوں کا دورہ کر چکا ہوں۔ ممالک اسلامیہ میں عرب اور افریقی ممالک میں بھی گیا ہوں اس مسئلے میں وہاں کے حالات کا جائزہ بھی لیا ہے ضبط تولید کے مسئلے پر مختلف عقائد کے علماء کی رائے اور تبصرے موجود ہیں۔ عرب اور دیگر اسلامی ملکوں کے مختلف الخیال علمائے کرام نے بھی اس مسئلے پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ میری نگاہ سے یہ تبصرے گذرے ہیں۔ میں نے بذات خود بھی اس مسئلہ پر کافی غور کیا ہے اور میں اپنے مطالعے اور غور و فکر کی روشنی میں اس سے متفق ہوں کہ اسلام ضبط تولید یا فیملی پلاننگ میں مانع نہیں ہے۔

لہذا ہم سب کو "کم اولاد پیدا کرو" کے مسئلے پر دل سے عمل کرنا چاہیئے اور گورنمنٹ آف انڈیا کی مدد کرنی چاہیئے۔ گورنمنٹ نے اس بارے میں کچھ طریقے ایجاد کئے ہیں۔ جگہ جگہ اس مقصد کے لئے مشورہ اور تدارک کے واسطے سنٹر قائم کئے ہیں۔ ہم کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیئے اور اس طرح اس مشکل مسئلے میں ہمیں حکومت کا ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ حکومت کا ہاتھ بٹانا اپنی ہی مدد کرنا ہے

اور یہ اپنی مدد گویا کہ پورے ملک اور پوری قوم کی مدد ہے۔ دستخط شدہ

سید عبداللہ بخاری

نائب امام شاہی جامع مسجد دہلی

ہم سید صاحب کے دلچسپ دلائل سے تعرض کرنے سے قبل ان کے غیر ملکی دورے کے متعلق کچھ عرض کریں گے جس کا ذکر انھوں نے اپنی جہاندیدگی کے ثبوت میں اس طور پر کیا ہے کہ عوام بیچارے رعب میں آجائیں۔ انھیں کیا معلوم کہ یہ دورہ کیسا تھا اور کس کے خرچ پر کیا گیا۔ وہ سید صاحب کے نظر فریب اجمال سے اس خوش فہمی میں بھی مبتلا ہو سکتے ہیں۔ — اور غالباً اسی میں مبتلا کرنا مقصود بھی ہے — کہ سید صاحب کوئی بہت بڑے بین الاقوامی شہرت کے عالم ہوں گے جنھیں مولانا مودودی اور مولانا علی میاں جیسے نامور علماء کی طرح عرب و افریقہ کی اسلام پسند تنظیموں یا علمی و مذہبی اداروں یا حکومتوں نے مدعو کیا ہوگا۔

کاش ایسا ہوتا تو ہم انھیں مبارک باد پیش کرتے۔ مگر ہوا شومئی قسمت سے یہ ہے کہ عرب و افریقہ کے علمی و دینی حلقے سید صاحب کے نام تک سے آشنا نہیں اور ان ملکوں کے سیر سپاٹے کی سعادت سید صاحب کو ہماری سیکولر حکومت نے ایما اور خرچ پر حاصل ہوئی۔ وہ کسی نیک کام کے لئے نہیں گئے تھے بلکہ حکومتِ وقت کا آلۂ کار بن کر گئے تھے۔ باہر کی دنیا کو یہ بتلانے گئے تھے کہ ہندوستان جنت نشان میں اہل اسلام مکمل خیریت سے ہیں۔ انھیں تمام وہی حقوق حاصل ہیں جو دستور میں دیئے گئے ہیں۔ شاندار جمہوریت اور قابلِ رشک سیکولر ازم کے ظلِ عاطفت میں وہ چین کی بانسری بجا رہے ہیں۔

ایک موٹی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ حکومتِ وقت اپنی خواہش اور اپنے خرچ پر جن لوگوں کو باہر بھیجتی ہے وہ کس مٹی سے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ آج کی حکومت جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے وہ تو دس روپے بھی کسی کو بلا سود قرض نہیں دے سکتے اور سود کے علاوہ کوئی نہ کوئی چیز گروی بھی رکھ لیتے ہیں۔ اب سوچ لیجئے کہ ضمیروں کو گروی رکھے بغیر ہمارے آج کے حکمراں زرِ مبادلہ جیسی نعمت کا کوئی حصہ کسی مولوی صاحب پر کیسے خرچ کر سکتے ہیں اور اس خرچ کا سود کم سے کم یہ تو ہونا ہی چاہیئے کہ مولوی صاحب جب تک باہر رہیں حکومت کی بولی بولتے رہیں اور جب لوٹ کر گھر آئیں تو ایسے نغمے ان کے ہونٹوں سے برملا طلوع ہوں جو حکومت کے کانوں میں رس گھولیں اور اس کی آنکھوں کو نور اور دل کو سرور پہنچائیں۔

جن لوگوں کو بھی سید صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا یا ان کی کسی تقریر کی سماعت کا موقع ملے وہ ان سے زیادہ نہیں بس یہی سوال کر کے دیکھ لیں کہ حضور جو غیر ممالک تشریف لے گئے تھے اس کا جغرافیہ کیا تھا؟ اگر جواب میں وہ یہ ثابت کر سکیں کہ باہر کے کسی معروف علمی و مذہبی ادارے یا کسی اسلام پسند حکومت نے اپنے خرچ پر انھیں دعوت دی تھی تب تو بے شک اس غیر ملکی دورے سے ان کی شخصیت میں کوئی وزن پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر معاملہ یوں نہیں تھا بلکہ وہی تھا جو ہم نے عرض کیا تو پھر اس کے سوا کیا کہا سکتا ہے کہ وہ فتویٰ نہیں دے رہے ہیں بلکہ "جس کا کھاؤ اسی کا گاؤ" کی کہاوت پر عمل کر رہے ہیں۔

اب اس پہلو پر نظر ڈالئے کہ عرب اور دیگر اسلامی ملکوں کے علماء کی آراء اور تبصروں کا ذکر انھوں نے کس انداز میں کیا۔ بظاہر وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ یہ علماء بھی فیملی پلاننگ کے حق میں ہیں۔ لیکن امر واقعہ اس کے برعکس ہے۔ آپ اگر حافظے پر زور دیں تو یاد آجائے گا کہ ہم کم و بیش ایک سال قبل تجلی کے صفحات میں دنیا بھر کے علماء و فضلاء کا متفقہ فتویٰ نقل کر چکے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ پھر ایک بار اس پر نظر ڈال لیں۔ چالیس ملکوں کے سو سے اوپر ممتاز علماء و فقہا نے مجمع البحوث الاسلامیۃ کی کانفرنس (منعقدہ مئی ۶۵ء) میں تفصیلی بحث کے بعد جو فیصلے متعدد موضوعات پر دیئے تھے ان میں فیملی پلاننگ کے موضوع پر ان کا متفقہ فیصلہ یہ تھا:۔

"(۱) اسلام نے نسل بڑھانے اور اولاد زیادہ پیدا کرنے کی ترغیب دی ہے اس لئے تکثیر نسل (انفرادی قوت) اُمت اسلامیہ کی اجتماعی، اقتصادی اور حربی (فوجی) تقویت کا موجب ہے اور اس کی (قومی) شرکت و طاقت کے اضافہ کا باعث ہے۔

(۲) اگر شخصی ضرورت (صحت وغیرہ) اولاد کے اضافے کو روکنے کی متقاضی اور موجب ہو تو شوہر صرف ضرورت کی حد تک وقتی طور پر احتیاطی تدابیر اختیار کر سکتا ہے مگر اس وقتی ضرورت اور اس کے پورا کرنے کا معاملہ صرف شوہر سے فیما بینہ و بین اللہ متعلق ہے (حکومت اس سلسلے میں کوئی اقدام نہیں کر سکتی)

(۳) کسی بھی صورت میں اور کسی بھی وجہ کی بناء پر ایسے قوانین نہیں بنائے (اور نافذ کئے) جا سکتے جو لوگوں کو افزائش نسل روکنے پر مجبور کریں۔" (تجلی دسمبر ۶۶ء)

یہ ممالک اسلامیہ کے ارباب علم و فضل کا حال ہوا۔ اب ہند و پاک کے جانے پہچانے علماء اور اہل فکر و تفقہ کا حال دیکھئے تو وہ بھی اس کے سوا کچھ نہ ملے گا کہ فیملی پلاننگ کے نام نہاد کاز سے وہ سخت بیزار ہیں اور تقریر و تحریر کے ذرائع سے ان کی مدلل مخالفت بارہا سامنے آچکی ہے۔ پھر بھلا سید صاحب کی مبہم اور مغالطہ انگیز موشگافی کو سوائے لفاظی اور سخن سنجی کے کیا معنی دیئے جائیں۔ وہ اپنی حد تک تو بے شک مختار ہیں کہ جو چاہے رائے رکھیں اور جس چاہے فیصلے پر پہنچیں۔ مگر یہ بات نہایت نامعقول ہے کہ عوام کو وہ دوسرے علماء کی رائے اور فتوے کے بارے میں خلاف واقعہ تاثر دے کر شریعت سے استہزاء کر رہے ہیں۔

آئیے ان کے ان چٹکلوں پر بھی نظر ڈالیں جنھیں انھوں نے بزعم خود دلائل کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

وہ روزانہ ۵۵ ہزار اولادوں کا ہوا کھڑا کرتے ہیں۔ سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ تعداد آپ کے علم میں کہاں سے آئی؟ اگر یہ تعداد ہمارے دیس ہی کے کسی بزرگوار یا کسی کمیٹی کی ریسرچ کا نتیجہ ہے تو دریافت کیا جا سکتا ہے کہ ایسے ستم ظریف حضرات کے حساب کتاب کا آپ نے اعتبار کیسے کر لیا جن کی دیانت نے ہندوستان میں اُردو والوں کی تعداد صرف اتنی بتائی ہے کہ ملک کے فقط ایک صوبے میں اس سے کئی گنی تعداد ہر آنکھ والا دیکھ سکتا ہے۔ یہ لوگ اپنے اغراض و مقاصد کی خاطر سیاہ کو سفید اور تلخ کو شیریں کہنے میں بھی ذرا نہیں شرماتے۔ چنانچہ آپ ان تمام فلموں کو "ہندی فلموں" کی فہرست میں پائیں گے جن میں الف سے لیکر یا تک اُردو ہی اُردو ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد علیہ الرحمۃ جیسے شخص کی تقریر پر "ہندی" کا عنوان دیکھیں گے اور اس طرح کی ستم ظریفیاں زندگی کے متعدد شعبوں میں نظر آئیں گی۔ پھر فرمایئے ایسے کردار اور اس نوع کے اندازِ فکر والوں کی کوئی بھی اعداد شماری قابلِ اعتماد کیسے ہو سکتی ہے۔

دوسرے یہ کہ ولادتوں کی گنتی تو آپ نے پیش کر دی۔ لیکن اموات کا زائچہ نظر انداز کر گئے۔ کیا مرنے کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے؟ کیا بس وَن وے ٹریفک جاری ہے کہ آنے والے تو آ رہے ہیں مگر جانے والے جا نہیں رہے ہیں؟ معقولیت یہ تھی کہ روزانہ مرنے والوں کا شمار بھی تو سامنے لائے ہوتے اور پھر اس سوال کا بھی جواب تیار کیا ہوتا کہ شمار قدرتی اور طبعی اموات کا تو ہو سکتا ہے لیکن ان اموات کا حساب کیسے لگے گا جو آئے دن کے فسادات میں مسلمانوں کا نصیب بن گئی ہیں۔ کیا سید صاحب اس سے بے خبر ہیں کہ آزادی کے بعد سے ہمارے دیس میں فسادات کی کیسی فصلِ بہار لہلہا رہی ہے اور کتنے بے شمار مسلمان ان میں شہید کئے جا چکے ہیں۔ پھر یہ سلسلہ اختتام پذیر بھی نہیں۔ مشکل سے کوئی مہینہ گزرتا ہو گا کہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی بہانے مسلمانوں کے جان و مال کی ہولی نہ کھیلی جاتی ہو، مگر سید صاحب جیسے ستم ظریف

حضرات فقط ولادتوں کی گنتی لئے پھر رہے ہیں حالانکہ یہ گنتی اپنی صحت کے لئے خود بھی محتاجِ ثبوت ہی ہے۔

اب آئیے زمین کے طول و عرض پر۔ سید صاحب نے اپنے ملک کی زمین کا ناپ پیش نہیں کیا حالانکہ اگر انکا مقصد یہی تھا کہ ہماری زمین آنے والی نسل کی سمائی کے لئے کافی نہیں ہے تو اس کے لئے انھیں لازماً یہ حساب بھی بتانا چاہئے تھا کہ زمین فقط اتنے گز ہے اور آنے والی نسل کے لئے اس سے اتنی زیادہ زمین ضروری ہوگی۔

مہمل گوئی کا کوئی جواب نہیں۔ سادہ لوحوں کو بیوقوف بنانے کے لئے جو چاہے شوشہ چھوڑ دیجئے۔ زمین تو بفضلہ تعالیٰ اپنے دیس میں اتنی ہے کہ اگر موجودہ آبادی سے دس گنی آبادی ہو جائے تب بھی لاکھوں میل زمین بچی پڑی رہے گی۔

رہی مکان کی مثال تو یہ بجائے خود مغالطہ انگیز ہونے کے علاوہ پیش بھی مغالطہ دینے کے انداز میں کی گئی ہے۔ ذرا بتائیے تو "اچانک" سو مہمانوں کے نزول کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ کیا یہ بھی کسی ایسے جانور کا ذکر ہے جو ایک ہی جھول میں سو سو بچے دے ڈالتا ہو۔ ممکن ہے سید صاحب کے یہاں انسانی بچوں کی پیدائش کا نظام اور اسلوب دنیا بھر سے نرالا ہو ورنہ دنیا میں تو کوئی بھی عورت دفعتاً سو پچاس بچے نہیں جنتی۔ بہت ہوئے تو دو چار ایک مرتبہ میں ہو گئے۔ وہ بھی شاذ۔ اور ان میں بھی جیتا مشکل سے کوئی ایک ہی آدھ ہے۔ یہ دراصل مغالطہ انگیزی کا اسلوب ہے کہ سید صاحب نے ایک ہی مکان میں اچانک سو مہمانوں کو بلا لیا ورنہ سو "مہمان" تو کسی گھر میں ایک صدی سے کم مدت میں آنے والے نہیں۔ خوب ہے یہ استدلال کہ مکان چونکہ چھوٹا ہے اس لئے نئے مہمانوں کو آنے سے روکو۔ کیا نئے مکان نہیں بن سکتے۔ کیا دیش کی زمین کا چپہ چپہ عمارتوں سے گھر چکا ہے کہ اب مزید عمارت سازی ممکن ہی نہیں۔

ایک مسلمان جب یہ کہتا ہے کہ آمدنی ایک بچے کے گذارے کے لائق ہو اور بچے دس ہوں تو کیسے گذارا ہوگا۔ — اس وقت وہ حقیقتاً اسلامی عقیدہ و تصور سے بہت دور ہوتا ہے۔ کیا کوئی مسلمان قرآن کے اس بیان محکم میں شک کر سکتا ہے کہ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (زمین پر بسنے والا کوئی ذی روح ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو) یہ عین کفر ہے کہ ہم اپنے بچوں کا رزق دہندہ خود اپنے آپ کو تصور کرنے لگیں۔ دنیا دار الاسباب ہے، لہٰذا یہاں جو بھی رزق کسی کو پہنچے گا وہ اسباب و ذرائع ہی کے تحت پہنچے گا مگر مسلمان اور کافر میں فرق بس اتنا ہی تو ہے کہ کافر تو انھی ظاہری اسباب و وسائل کو حقیقی عامل تصور کرتا ہے مگر مسلمان انھیں ثانوی حیثیت میں رکھ کر تقدیر الٰہی کو فیصلہ کن اہمیت دیتا ہے۔ آپ اپنے اہل و عیال کے لئے خواہ کتنی ہی محنت روزی کمانے میں صرف کریں۔ یا بالکل ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ جائیں۔ یہ طے ہے کہ جتنا رزق ان کے لئے خلاقِ اکبر نے مقدر کر دیا ہے اتنا ہی دونوں حالتوں میں پہنچے گا۔ تدبیر اپنی جگہ برحق ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ تدبیر سے غفلت محنت سے فرار اور تگ و دو سے جان چرانے کا محاسبہ اللہ ضرور کرے گا۔ لیکن جہاں تک رزق کا معاملہ ہے کسی کی یہ مجال نہیں کہ مقدر شدہ رزق میں ایک حبہ بڑھایا گھٹا سکے۔ وہ تو ہر حال میں ہر ذی روح کو پہنچنا ہی ہے اور کوئی اس کا ہزارواں حصہ بھی غصب نہیں کر سکتا۔

قرآن سے بڑھ کر مسلمان کے لئے کوئی سند نہیں آئیے اسے دیکھیں۔ جب ہم سورۂ بنی اسرائیل کھولتے ہیں تو ہمیں اپنے موضوع سے متعلق یہ آیت ملتی ہے:۔

لَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ	اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے مت قتل کرو، ہم روزی دیتے ہیں انھیں بھی اور تمھیں بھی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ زمانۂ جاہلیت کے عرب میں بھی افزائش نسل کو روکنے کا ٹھیک وہی ذہن موجود تھا جو آج فیملی پلاننگ کے پیچھے کام کر رہا ہے۔ ایسا کوئی ثبوت

تاریخ سے نہیں ملتا کہ اہل عرب اپنی پلی پلائی اولادوں کو مار ڈالتے ہوں۔ ان کے یہاں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کا رواج تو تھا، لیکن ظاہر ہے کہ اس رواج کا تعلق خوفِ غربت سے نہیں تھا۔ یہ تو غیرت کے ایک مریض اور بیہودہ احساس پر مبنی تھا ورنہ کھلی بات ہے کہ افلاس کے ڈر سے محض لڑکیوں کا مار ڈالنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لڑکیاں تو یوں بھی لڑکوں سے کم ہی کھاتی ہیں۔ اگر دونوں جنسوں میں انتخاب ہی کیا جاتا تو انتخاب لڑکوں کا ہوتا نہ کہ لڑکیوں کا۔ اور پھر انتخاب کا بھی کوئی منطقی جواز نہیں جب کہ مار ڈالنا خوفِ غربت سے ہو۔ یہ خوف تو صریحاً اس کا متقاضی تھا کہ ہر قسم کی اولاد ذبح کر دی جاتی۔ مگر ایسا کسی تاریخ سے ثابت نہیں۔

پھر یہ کونسا قتلِ اولاد ہے جس سے قرآن روک رہا ہے؟ — اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ وہی قتلِ اولاد ہے جو برتھ کنٹرول کی نوع بہ نوع ترکیبوں کے ذریعہ کیا جاتا تھا۔ گویا ضبطِ تولید کے کسی بھی طریقے سے آنے والی نسل کو روکنا اور استقرارِ حمل نہ ہونے دینا — یا استقرارِ حمل کے بعد اسقاط کا اقدام کرنا اللہ کے نزدیک قتلِ اولاد کے مرادف ٹھیرا — آیت کہتی ہے کہ افلاس کے ڈر سے اولاد کا قتل حرام ہے۔

پھر ایک قدم آگے بڑھ کر قرآن نے یہاں تک وضاحت کر دی کہ صرف خوفِ افلاس ہی سے نہیں بلکہ افلاس اگر بالفعل موجود ہو تب بھی ضبطِ تولید یعنی قتلِ اولاد جائز نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو سورۂ انعام آیت ۱۱۵۔

لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ	اپنی اولاد کو مفلسی کی بناء پر قتل مت کرو۔ ہم تمھیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمھاری اولاد کو بھی۔

گویا بنی اسرائیل والی آیت سے تو بس اتنا ہی معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ بالفعل تو مفلس نہ ہوں مگر ان کی آمدنی اتنی محدود ہو کہ مزید اولاد پیدا ہو جانے کی صورت میں اس کے ناکافی ہو جانے کا ڈر ہو انھیں اس ڈر سے ضبطِ تولید کے چکر میں پڑنا جائز نہیں۔ لیکن سورۂ انعام کی آیت تو یہ بھی کھول دیتی ہے کہ اگر آپ بالفعل بھی مفلس ہیں پھر بھی آپ کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اولاد کی آمد کے راستے میں دیواریں کھڑی کریں۔ اگر ایسا کریں گے تو یہ خدا کی رزاقی کے عقیدے سے انحراف اور اسباب ظاہری ہی کو سب کچھ سمجھنے کے ملحدانہ تصور کا اعلان ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ رزق کا معاملہ ان مخصوص معاملوں میں ہے جو ایمان بالقدر کے اجزائے ترکیبی میں شامل ہے۔ آپ اگر مسلمان ہیں تو آپ کو لازماً یہ عقیدہ رکھنا ہوگا کہ جتنا رزق آپ کو مل رہا ہے وہ آپ کی معاشی جدوجہد اور اسباب ظاہر کے بل بوتے پر نہیں مل رہا ہے بلکہ عین تقدیر الٰہی کے تحت مل رہا ہے۔ اگر آپ کے دس بچے ہیں تو ان دسوں کا حصہ اس میں شامل ہے۔ یہ دس کے بجائے دو ہوتے تو بقیہ آٹھ کے حصے کا رزق آپ کو ملنے والے رزق میں سے کم کر لیا جاتا۔ ان دو کے اور آپ کی اپنی ذات کے حصے میں فقط اتنا ہی رزق آ سکتا تھا جو مقسوم ہے نہ کہ اس سے زائد۔ یہ ہرگز درست نہیں کہ دس بچوں کی موجودگی میں جتنا رزق آپ کو مل رہا ہے اتنا ہی اس وقت بھی ملتا جب کہ محض دو بچے ہوتے۔ کوئی ذی روح کسی دوسرے کے رزق کا ایک حبہ بھی غصب نہیں کر سکتا۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ اگر کسی واقعے میں بظاہر نظر بھی آ رہا ہو کہ فلاں شخص فلاں کا رزق چھین کر لے گیا تو اسلامی عقیدے کے مطابق حقیقت اس کے سوا کچھ نہ ہوگی کہ جو رزق چھینا گیا ہے وہ چھیننے ہی والے کے لئے مقدر کیا گیا تھا — یہ الگ بات ہے کہ قانونِ احتساب کے تحت اللہ تعالیٰ فعلِ غصب کا محاسبہ فرمائے گا اور جس سے غصب کیا گیا ہے اسے مظلومیت کا اجر دے گا۔ ذٰلک تقدیر العزیز الحکیم۔

اگر کوئی مدعیِ اسلام یہ راگ الاپتا ہے کہ "اسلام ضبطِ تولید یا فیملی پلاننگ میں مانع نہیں ہے" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے کوئی ایسا اسلام تلاش کر لیا

ہے جس کا سرچشمہ قرآن و حدیث نہیں ہیں بلکہ کسی اور ہی منبع و مخرج سے اس کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ فَاِنَّ هٰذَا الشَّیْءُ عُجَاب۔

عقل سلیم سے کام لیجئے تو ان معاشی محرومیوں کی جڑیں جنھیں آڑ بنا کر فیملی پلاننگ کا درس دیا جاتا ہے اس فاسد و کاسد نظامِ معیشت میں ہیں جو اپنی بنیادی اور اصولی خامیوں کے علاوہ نظام چلانے والوں کی بد کرداری "بے ایمانی" حرص و ہوس اور خود غرضی سے غلاظت کا ڈھیر بن کر رہ گیا ہے۔ دولت کی کمی ہے نہ غذا کی۔ زمین کم ہے نہ وہ پانی جو کھیتیوں کو لہلہا دیتا ہے۔ کمی ہے تو منصفانہ تقسیم دولت کی۔ عادلانہ نظامِ معیشت کی۔ کارپردازوں کے حسن کردار اور دیانت و امانت کی۔ آپ دفعتاً کسی آفتِ آسمانی کے نتیجے میں ساٹھ کروڑ سے تیس کروڑ رہ جائیں تب بھی یہاں نکبت و افلاس ہی کی وہی گنگا بہتی رہے گی جو آج بہہ رہی ہے۔ مسئلہ کثرتِ آبادی کا نہیں فسادِ نظم اور زوالِ انسانیت کا ہے خود غرضی اور دولت پرستی کا ہے۔ انصاف اور شرافت کے فقدان کا ہے۔ جامع لفظ استعمال کیجئے تو کہہ دیجئے کہ سارا مسئلہ "ظلم" کا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں ظلم ہی ظلم۔ ظلم کے اثرات اس کے سوا ہو بھی کیا سکتے ہیں کہ امن و عافیت مٹ جائیں۔ سکون و طمانیت تباہ ہو جائیں۔ افلاس و نکبت ڈیرے ڈال دیں۔ جہاں افلاس نہ ہو وہاں دوسرے افکار و آلام کا ہجوم ہو۔ امراض ہوں۔ خودکشیاں ہوں۔ قتل و غارت کی فصلِ بہار لہلہائے۔ خوف ہو۔ مستقبل سے مایوسی اور حال سے بے اطمینانی ہو۔

عقائد اور آخرت کی بحث سے گزر کر یہ بھی سن لیجئے کہ مصنوعی طریقوں سے اولاد کی پیدائش روکنا بیشمار امراض جسمانی کا موجب بنتا ہے۔ اختلاج، تشنج، زود رنجی، چڑچڑا پن، عدم برداشت وغیر ذلک۔ اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرنے والے حضرات بلادِ مغرب کے نامور ڈاکٹروں کی ان رپورٹوں سے بے خبر نہ ہوں گے جن میں بتایا گیا ہے کہ برتھ کنٹرول اور اسقاط کے نتیجے میں کیسی کیسی ذہنی اور بدنی بیماریاں مرد و زن میں پھیل رہی ہیں۔ ہمارا معاشرہ ابھی ان روگوں اور مالیخولیاؤں سے آشنا نہیں جنھوں نے مغرب کے ہر ترقی یافتہ ملک میں خودکشی کو معمولات زندگی میں داخل کر دیا ہے۔ جو لوگ مغربی اقدار و افکار کو یہاں پھیلانا چاہتے ہیں وہ حقیقتاً ہمارے بدترین دشمن ہیں خواہ ان کی ٹانگوں میں پتلون ہو یا مغلئی پاجامہ۔ ہمیں چاہیئے کہ ان کے سائے تک سے دور بھاگیں اور بھاگنا اگر بعض حالتوں میں ممکن نہ ہو تو پھر سید عبد اللہ جیسے واعظین کرام سے صاف کہدیں کہ جس حکومت کا ہاتھ ہٹانے کی آپ تلقین کر رہے ہیں اس سے پہلے ہمارے حقوق تو دلوائیے۔ اس کے سایۂ اقتدار میں قریہ قریہ ہمیں لوٹا جا رہا ہے، مارا جا رہا ہے، ذلیل و پامال کیا جا رہا ہے۔ وہ اگر ہمارے جان و مال تک کا تحفظ نہیں کر سکتی تو ہم کس دل سے اس کا ہاتھ ہٹا سکتے ہیں۔

پتہ نہیں۔ خود مفتی محترم جناب سید عبد اللہ بخاری صاحب نے اپنی نس بندی کرالی ہے یا نہیں۔ گمان یہی ہوتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہوں گے۔ اگر یہ گمان درست نہیں بلکہ مفتی محترم ابھی تک کنوارے ہی ہیں تب تو ان کے فتوے کو اس وقت تک معلق سمجھنا چاہیئے جب تک وہ شادی کر کے دو تین بچے نہ پیدا کر لیں۔ دو یا تین بچے پیدا کر کے اگر انھوں نے اپنی نس بندی کرالی یا ضبط تولید کا کوئی اور طریقہ علانیہ اختیار کیا تب بیشک اعتراف کیا جا سکے گا کہ وہ اپنے فتوے میں مخلص ہیں۔

اور اگر گمان درست ہے یعنی وہ شادی شدہ ہیں تو ان سے دریافت کرنا چاہیئے کہ بچوں کے معاملے میں ان کی کیا پوزیشن ہے۔ یہ بڑا سنجیدہ پن ہوگا کہ بچارے عوام کالانعام تو ان کے فتوے سے مرعوب ہو کر خود کو خصی کرالیں اور خود مفتی محترم آزادی سے بچے پیدا کئے جائیں۔ ان کے فتوے کا مبنی بر

بر اخلاص ہونا اسی وقت تسلیم کیا جا سکتا ہے جب وہ یہ ثابت کر دیں کہ جو سبق وہ دوسروں کو دے رہے ہیں اس پر خود بھی عمل پیرا ہیں۔ ہمارا قیاس یہ ہے کہ ابھی تک مفتی محترم نے کسی بھی فیملی پلاننگ سینٹر کو اپنی نس بندی کے شرف سے مشرف نہیں کیا۔ فتوے میں زور اسی وقت پیدا ہوگا جب وہ ایک مقررہ تاریخ کا اعلان کر کے عوام کو دعوت دینگے کہ آؤ فلاں سینٹر میں فلاں وقت بندہ بھی خصی ہونیکی سعادت حاصل کر رہا ہے۔

ویسے یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ موصوف نے اگر خود کو خصی کرا لیا یا خصی کرانے کے بعد ہی یہ فتویٰ صادر کیا ہے تو اس سے صرف یہ ثابت ہو جائے گا کہ کم سے کم اس فتوے کی حد تک وہ منافق نہیں ہیں بلکہ ان کا قول و عمل یکسانی رکھتا ہے لیکن یہ ثابت ہو جانے سے مسئلے کی فقہی حیثیت میں تبدیلی واقع نہ ہوگی۔ فقہی حیثیت بہر حال یہی ہے کہ فیملی پلاننگ صرف اُس خالق و مالک کا حق ہے جو اتنے بڑے نظام کائنات کو چلا رہا ہے۔ وہی صحیح طور پر جان سکتا ہے کہ کب کس کے کتنے بچے پیدا ہوں۔ اس حق کو ہمیں اپنے ہاتھ میں لینے کا کوئی استحقاق نہیں اور فی الحقیقت ہم لے بھی نہیں سکتے۔ سوائے اس کے کہ سرتابی اور بدعقیدگی کے مجرم بن کر اپنی آخرت تباہ کر لیں۔

شریعت نے جن صورتوں میں ضبطِ ولادت کی اجازت دی ہے ان میں کوئی بھی ایسی نہیں جس کے ڈانڈے بے نام نہاد فیملی پلاننگ سے ملتے ہوں۔ یہ تمام صورتیں انفرادی مصالح کی حیثیت رکھتی ہیں اور منصوبہ بندی کا کوئی تصور ان کے پیچھے کارفرما نہیں ہے۔

دیہاتی معالج

ویسے تو یہ کتاب بظاہر دیہاتیوں کے کام کی نظر آتی ہے مگر حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ ہم اور آپ بھی اس سے بیش بہا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ اس میں آئے دن وارد ہونے والے تمام امراض کا علاج ایسی چیزوں سے تجویز کیا گیا ہے جن میں کتنی ہی چیزیں ہمارے گھروں اور بازاروں میں موجود رہتی ہیں مثلاً سادہ مرچ، کھٹائی، شہد، پھٹکڑی، لہسن، پیاز، الائچی، ہلدی وغیرہ۔ گھر میں اس کتاب کا رہنا بڑی ہی نعمت ہے کہ بعض ناگہانی امراض یا حادثات میں یہ فوری رہنمائی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ چھپائی اعلیٰ عکسی۔ انسانی اعضاء اور خاص جڑی بوٹیوں کی بے شمار تصویریں۔ حصہ اول کے صفحات ۳۱۲ قیمت۔ تین روپے ۳/- حصہ دوم کے صفحات ۳۳۲ قیمت۔ دو روپے پچاس ۲/۵۰ پیسے

عربی سیکھنے کیلئے عمدہ کتابیں

تعلیم الصرف مؤلفہ:۔ مولوی ہلال عثمانی استاد دارالعلوم دیوبند۔ اس کتاب کے حصہ اول کا اعلان پہلے سے جاری ہے۔ قیمت ۲/- دو روپے۔ اب حصہ ثانی بھی چھپ کر آگیا ہے۔ قیمت ایک ۱/- روپیہ۔

المطالعۃ العزیزہ عربی کی مشق و تمرین کیلئے تعلیم الصرف کے ساتھ اس کا مطالعہ بھی مفید ہوگا۔ قیمت صرف ۲۵ پیسے۔

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

دُرِ نجف

ایک تولہ چھ روپے | نصف تولہ تین روپے پچاس پیسے | تین ماشہ ایک روپیہ ۷۵ پیسے | ڈاک خرچ ڈیڑھ روپیہ

کوئی سی بھی تین شیشیاں ایک ساتھ منگانے پر ڈاک خرچ معاف۔

دارالفیض رحمانی۔ دیوبند (یو۔پی)

ماہنامہ مجلس لاہور

جون کا مجلس افسانہ نمبر ہوگا

جس میں پاک و ہند کے نئے اور پرانے افسانہ نگار حصہ لے رہے ہیں۔ حیات افروز، منتخب اور سبق آموز متعدد افسانوں پر مشتمل یہ نمبر سالانہ خریداروں کو سالانہ چندہ ہی میں دیا جائے گا آپ بھی مجلس کی سالانہ خریداری قبول فرما کر افسانہ نمبر اور سالنامہ مفت حاصل کریں۔

افسانہ نمبر معمول سے کہیں زیادہ تعداد میں شائع کرنے کا پروگرام ہے اس لئے مشتہرین حضرات اپنے اشتہارات اور ایجنٹ صاحبان اپنی تعداد مطلوبہ ۱۵ مئی ۶۸ء تک بھیجکر اس نمبر سے بیش از بیش فائدہ اٹھائیں۔　　(سالانہ — بارہ روپے)

منیجر ماہنامہ مجلس ۔ امرت دھارا بلڈنگ ۔ ریلوے روڈ لاہور

تفسیر مظہری عربی کامل

دس ضخیم جلدوں میں

فقیہ الہند قاضی محمد ثناء اللہ صاحب پانی پتیؒ کی لاثانی تفسیر

تفسیر مظہری مختلف خصوصیتوں کے لحاظ سے تمام تفسیروں میں بہترین سمجھی گئی ہے، احادیث و آثار کے بیان۔ کلام الٰہی کے مطالب کی تفہیم اور احکام شرعیہ کے استنباط، اُن کی تشریح و تفصیل حنفی نقطۂ نگاہ کے اعتبار سے قاضی صاحب کی یہ تفسیر اپنا جواب نہیں رکھتی۔ ادارہ نے اولاً نایاب قلمی نسخوں کو فراہم کر کے اس کو شائع کیا تھا۔ جو عرصہ سے نایاب تھی۔ اب حال ہی میں دوبارہ مکمل کر کے شائع کیا ہے۔ مدارس عربیہ اور تاجران کتب کی اطلاع کی غرض سے یہ اعلان کیا جاتا ہے۔ عربی کتاب کے خواہشمند جلد طلب فرمالیں۔ ورنہ ابتدائی حصص ختم ہو جانے پر مزید انتظار کرنا ہوگا۔

کامل سیٹ کی قیمت نوّے ۹۰ روپے ہے

منیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

مولانا مودودی کا نامۂ گرامی

پوپ پال ششم کے جواب میں

عیسائیت سے اسلام کی شکایت کے چار پہلو

پوپ پال ششم کا خط

ہم دنیا کے تمام خیر اندیش انسانوں سے مخاطب ہیں کیا وہ دنیا بھر میں نئے سال کے پہلے دن یکم جنوری کو یوم امن منائیں۔ ہمارا خیال ہے کہ بحالاتِ موجودہ امن کی ضرورت اور اس کے خلاف پیدا شدہ خطرات کو وہ ساری قومیں بین الاقوامی مذہبی تنظیمیں اور تہذیبی و سیاسی تحریکیں محسوس کر رہی ہیں جن کا مطمحِ نظر عالمی قیامِ امن ہے اور جو اسی کے لئے کوشاں ہیں۔ "قیامِ امن" کی راہ میں جو موانع درپیش ہیں اُن کا ازالہ ضروری ہے۔ ان موانع میں سے چند ایک یہ ہیں کہ اقوامِ عالم باہمی تعلقات میں خود غرضی برت رہی ہیں یعنی آبادیاں اس احساس کا شکار ہیں کہ انھیں عزت و شرف اور وقار کی زندگی بسر کرنے سے محروم کر دیا گیا ہے اور اس حق کے عدم اعتراف کی بناء پر یہ لوگ سر بکف ہو کر تنگ آمد بجنگ آمد کی روش اختیار کر چکے ہیں یہ نظریہ اور اعتقاد عام ہو گیا ہے کہ بین الاقوامی تنازعات عدل و انصاف اور آپس کی گفت و شنید کے معقول ذرائع سے طے نہیں کئے جا سکتے بلکہ انھیں قاضی شمشیر کے حوالے کر دینا ضروری ہے جو خوں ریزی اور قتلِ انسانی کے غیر محدود آلات و وسائل استعمال کر سکتا ہے۔

امن و سلامتی اور بقائے باہمی کے لئے ناگزیر ہے کہ نئی نسلوں کو رواداری، اخوت اور عالمگیر مساوات کی تربیت دی جائے۔ امن و امان محض لفاظیوں کے بل پر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کا زبانی جمع خرچ بظاہر خوش آئند نظر آتا ہے کیونکہ یہ انسانیت کے دل کی آواز ہے۔ لیکن اکثر و بیشتر یہ چیز نہ صرف بے عملی اور عدمِ خلوص کو چھپانے کے لئے

ایک لبادے کا کام دیتی ہے بلکہ بسا اوقات
جانبداری اور ظلم وتعدی کا آلۂ کار بن جاتی ہے
جب تک ریاستیں ایک دوسرے کے ساتھ اور
مختلف ریاستوں کے اندر حکام اور شہریانِ ریاست
باہم دگر محبت، اخلاص اور انصاف کو اپنا حقیقی
شعار نہ بنائیں اور جب تک افراد اور اقوام کو
تہذیبی اخلاقی اور مذہبی دائروں میں قول وعمل
کی آزادی حاصل نہ ہو اس وقت تک امن کی
باتیں کرنا بالکل بے معنی اور لاحاصل ہے آزادی
اور سلامتی کے ان لوازم کے بغیر اگر تغلب وتسلط
کے ذریعہ سے امن وامان اور قانونی نظم وضبط
کا ظاہری ڈھانچہ قائم بھی ہو جائے تب بھی ہیجان
بغاوت اور جنگ وجدال کا ایک لامتناہی اور
ناقابلِ تسخیر سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا ——— (تلخیص)

جواب

چند روز پہلے مجھے ڈاکٹر آر، اے، بٹلر، ڈائریکٹر لایل ہال لاہور کے توسط سے آپ کا وہ نہایت قابلِ قدر پیغام پہنچا جس میں آپ نے نئے سال کا آغاز ایک "یوم امن" کی تقریب سے کرنے کی اپیل کیتھولک چرچ کے معتقدین کے علاوہ تمام دنیا کے بڑے بڑے ادیان کے پیرووں اور تمام نیک خواہشات رکھنے والے لوگوں سے کی تھی۔ اس پیغام کے متعلق میں اپنے خیالات آپ تک جلدی پہنچانا چاہتا تھا۔ مگر رمضان اور عید الفطر کی مصروفیات اس میں مانع رہیں۔ اب پہلی فرصت میں میں آپ کو خطاب کر رہا ہوں۔

میں آپ کو اس بات پر مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے ایک ایسے مقصد کی طرف دنیا کے انسانوں کو دعوت دی جو سب کا مشترکہ مقصد ہے اور ساتھ ساتھ ان اہم اسباب کی نشاندہی بھی کی جو اس مقصد کے حصول میں سدِّ راہ ہیں۔ فی الحقیقت امن ان اولین بنیادی ضروریات میں سے ہے جن پر نوعِ انسانی کی فلاح وبہبود کا انحصار ہے۔ مگر اسکی خواہش اور ضرورت کا احساس رکھنے کے باوجود جن وجوہ سے انسان ہمیشہ اس سے محروم ہوتا رہا ہے اور آج بھی محروم ہے۔ وہ وہی وجوہ ہیں جن میں سے اکثر کی طرف آپ نے صحیح طور پر دنیا کے لوگوں کو توجہ دلائی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک عملاً انھیں رفع کرنے کے لئے کچھ نہ کیا جائے گا۔ محض پاکیزہ خواہشات اور تمناؤں کے اظہار سے کوئی امن دنیا کو میسر نہ آسکے گا۔ اس بناء پر میرے نزدیک یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر ایک شخص، قوم، مجموعۂ اقوام اور پیروانِ مذاہب کا گروہ پورے خلوص اور دیانت کے ساتھ خود اپنا محاسبہ کرکے دیکھے کہ اس کی کوتاہیاں کیا ہیں جو اس کے ابنائے نوع کو اور بالآخر خود اس کو امن سے محروم کرنے کی موجب ہوتی ہیں اور جہاں تک بھی اس کے امکان میں ہو ان کو دفع کرنے کی کوشش کرے۔ اسی طرح ہم میں سے ہر ایک کو پوری صاف گوئی کے ساتھ اصلاح کی نیت سے نہ کہ تلخی پیدا کرنے اور بڑھانے کے لئے۔ دوسرے گروہوں کے نیک نیت لوگوں تک یہ بات پہنچانی چاہیئے کہ ان کے طرزِ عمل میں کیا چیزیں ایسی ہیں جو اس کے گروہ کے لئے موجب اذیت ہوتی ہیں تاکہ وہ انھیں رفع کرنے کی کوشش کر سکیں۔

ٹھیک اسی غرض کے لئے میں آپ کو چند ایسے امور کی طرف توجہ دلا رہا ہوں جو مسلمانوں کے لئے اپنے مسیحی بھائیوں سے وجہِ شکایت ہیں تاکہ کیتھولک چرچ کے پیشوائے اعظم ہونے کی حیثیت سے جو غیر معمولی اثر و رسوخ آپ کو مسیحی دنیا میں حاصل ہے۔ اس سے کام لے کر آپ ان کی اصلاح کے لئے سعی فرمائیں اور میں اس بات کا خیر مقدم کروں گا کہ ہمارے مسیحی بھائیوں کے لئے ہمارے طرزِ عمل میں اگر کوئی چیز معقول وجہِ شکایت ہو تو وہ ہمیں بتائی جائے۔ ہم انشاء اللہ انکو رفع کرنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ دنیا میں امن اور صلح وآشتی کی فضا پیدا کرنے میں ہم سب

اسی طرح مددگار بن سکتے ہیں کہ ایک دوسرے کے ساتھ انصاف کریں۔ دوسروں سے فیاضانہ سلوک کرنے کی فراخ حوصلگی اگر ہم میں موجود نہ بھی ہو تو کم از کم اتنا تو ہو کہ دوسروں کی حق تلفی کرنے یا ان کو اذیت دینے سے تو ہم باز رہیں۔

مسیحی بھائیوں کے طرزِ عمل میں جو امور کسی ایک ملک یا قوم کے نہیں، پوری دنیا کے مسلمانوں کے لئے وجہِ شکایت ہیں۔ انھیں میں کسی لاگ لپیٹ کے بغیر مختصراً آپ سے بیان کئے دیتا ہوں۔

(۱) ایک مدت دراز سے مسیحی اہلِ علم اپنی تحریروں اور تقریروں میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن اور اسلام پر جو حملے کر رہے ہیں اور آج بھی جن کا سلسلہ جاری ہے وہ مسلمانوں کے لئے انتہائی موجبِ اذیت ہیں۔ میں "حملے" کا لفظ قصداً استعمال کر رہا ہوں تاکہ آپ کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہماری شکایت معقول علمی تنقید کے خلاف ہے۔ علمی تنقید اگر دلیل کے ساتھ اور تہذیب و شائستگی کے حدود میں ہو تو خواہ وہ کیسے ہی سخت اعتراضات پر مشتمل ہو۔ ہم اس پر برا نہیں مانتے بلکہ اس کا خیر مقدم کرتے ہیں اور دلیل کا جواب دلیل سے دینے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن بجا طور پر شکایت ان حملوں کے خلاف ہے جو جھوٹے اور رکیک الزامات کی صورت میں اور نہایت دل آزار زبان میں کئے جاتے رہے ہیں اور اب تک کئے جا رہے ہیں۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے وہ حضرت مریم علیہا السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کا انتہائی ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہیں اور ان کے متعلق کوئی خلافِ ادب بات زبان سے نکالنا ہمارے عقیدے میں کفر ہے۔ آپ کوئی مثال ایسی نہیں پا سکتے کہ کسی مسلمان نے کبھی سیدنا مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ ماجدہ کی شان میں کوئی بے ادبی کی ہو۔ اگرچہ ہم حضرت مسیحؑ کی الوہیت کے قائل نہیں ہیں مگر ان کی نبوت پر ہمارا ویسا ہی ایمان ہے جیسا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ہے اور کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان پر اور دوسرے انبیاء پر ایمان نہ لائے۔ اسی طرح ہم صرف قرآن ہی کو نہیں بلکہ توراۃ اور انجیل کو بھی خدا کی کتابیں تسلیم کرتے ہیں اور کوئی مسلمان ان مقدس کتابوں کی توہین کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ ہماری طرف سے اگر کبھی بحث ہوتی ہے تو اس حیثیت سے ہوتی ہے کہ بائبل جس شکل میں آج پائی جاتی ہے یہ کہاں تک مستند ہے اور یہ بحث خود مسیحی علماء بھی کرتے رہے ہیں۔ لیکن کسی مسلمان نے کبھی اس کا انکار نہیں کیا کہ حضرت موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور بائبل کے دوسرے انبیاء پر اللہ کا کلام نازل ہوا تھا اور مسلمان چاہے یہ بات نہ مانتے ہوں کہ اس وقت پائی جانے والی پوری بائبل اللہ کا کلام ہے مگر یہ ضرور مانتے ہیں کہ اس میں اللہ کا کلام موجود ہے۔ لہٰذا ہمارے مسیحی بھائیوں کو ہم سے یہ شکایت کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا ہے کہ ہم ان کے انبیاء کی یا ان کی کتاب مقدس کی توہین کرتے ہیں۔ بخلاف اس کے ہمیں آئے دن رنج پہنچتا رہتا ہے اور صدیوں سے اس دل آزاری کا سلسلہ چل رہا ہے کہ ان کے مصنفین اور مقررین ہمارے نبیؐ اور ہماری کتابِ مقدس اور ہمارے دین پر سخت حملے کرتے ہیں۔ دنیا کی اسلامی اور مسیحی برادریوں کے درمیان تعلقات کی خرابی کا یہ ایک اہم سبب ہے۔ اس سے شدید باہمی منافرت پیدا ہوتی ہے اور مزید برآں اس ناروا پروپیگنڈے کا لازماً یہ نتیجہ بھی ہوتا ہے کہ مسیحی عوام کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و تحقیر کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ آپ دنیا کے امن کی بہت بڑی خدمت انجام دیں گے۔ اگر مسیحیت کے پیروؤں کو اس طرزِ عمل میں کم از کم اتنی اصلاح کر لینے کی نصیحت کریں کہ یہ دل آزاری اور نفرت انگیزی کی حد تک نہ پہنچے۔

(۲) مسیحی مشن اور مشنری ایک مدت دراز سے مسلم ممالک میں مسیحیت پھیلانے کے لئے جو طریقے استعمال کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں وہ بھی دنیا کے مسلمانوں کے لئے ایک بڑی وجہِ شکایت ہیں۔ دوسرے ملکوں اور آبادیوں میں ان کا جو طرزِ

عمل بھی ہو۔ اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔ مگر مسلمان ملکوں اور آبادیوں میں ہمارا تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ انھوں نے محض تبلیغ پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس سے تجاوز کر کے دوسرے متعدد ایسے طریقے اختیار کئے ہیں جو تبلیغ کے بجائے سیاسی دباؤ۔ معاشی طمع و تحریص اور اخلاقی و اعتقادی تخریب کی تعریف میں آتے ہیں جنھیں مشکل ہی سے کوئی معقول آدمی اشاعتِ مذہب کے جائز ذرائع تسلیم کر سکتا ہے۔ افریقہ کے ایک بڑے حصے میں انھوں نے استعماری طاقتوں کی مدد سے مسلمانوں کو تعلیم سے محروم کیا اور درسگاہوں کے دروازے ہر اس شخص پر بند کر دیئے جو مسیحیت قبول نہ کرے یا کم از کم اپنا اسلامی نام ترک کر کے مسیحی نام نہ اختیار کر لے۔ اس طریقے سے جو با اثر مسیحی اقلیت پیدا کی گئی۔ آزادی کا دور آنے کے بعد آج وہ بہت سی ایسی افریقی ریاستوں پر سیاسی، فوجی اور معاشی حیثیت سے مسلط ہے جن کی بیشتر آبادی مسلمان ہے۔ یہ ایک صریح ناانصافی تھی جو مسلم اکثریت رکھنے والے افریقی ملکوں کے ساتھ کی گئی۔ سوڈان میں برطانوی استعمار کی مدد سے مشنریوں نے جنوبی حصے کو اپنے لئے محفوظ علاقہ بنوالیا جس میں تعلیم اور تبلیغ کا حق صرف مسیحی مشنریوں کے لئے مختص کر دیا گیا اور مسلمانوں کے لئے تبلیغ تو درکنار دوسری اغراض تک کے لئے وہاں جانے پر پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کو کس دلیل سے اشاعت مذہب کا جائز و معقول طریقہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ خود ہمارے ملک میں مشن ہسپتالوں اور درسگاہوں کا معروف طریق کار یہ ہے کہ وہ مسلمان مریضوں اور طلبہ سے بے تحاشا فیسیں وصول کرتے ہیں اور جو غریب آدمی عیسائیت قبول کر لے اسے علاج اور تعلیم کی سہولتیں مفت یا برائے نام خرچ پر بہم پہنچاتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ تبلیغ نہیں بلکہ ضمیر و ایمان کی خرید و فروخت ہے۔ علاوہ بریں ان کی درسگاہیں ہمارے یہاں ایک ایسی نسل تیار کر رہی ہیں جو نہ مسیحیت اختیار کرتی ہے نہ مسلمان رہتی ہے بلکہ اپنے اخلاق و تہذیب، زبان اور طرز زندگی کے اعتبار سے ایک اجنبی عنصر بن کر رہ جاتی ہے اور مذہبی حیثیت سے اس کے اندر مسیحیت یا اسلام کے بجائے الحاد و بے دینی کے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں کیا کوئی معقول آدمی یہ مان سکتا ہے کہ یہ مذہب کی کوئی خدمت ہے جو مسیحی مشن انجام دے رہے ہیں؟ یہی وجوہ ہیں جن کی بناء پر مسلمان ملکوں میں عموماً ان مشنوں کو مذہبی تبلیغ کے بجائے اسلام اور مسلم معاشرے کے خلاف ایک سازش سمجھا جاتا ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس کے نتائج پر غور فرمائیں اور اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے مشنری اداروں کے طرزِ تبلیغ میں اصلاح کی کوشش کریں۔

(۳) مسیحی دنیا کے متعلق مسلمانوں کا عام احساس یہ ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک شدید جذبۂ عناد رکھتی ہے اور آئے دن ہمیں ایسے تجربات ہوتے رہتے ہیں جو اس احساس کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اس کا تازہ ترین تجربہ وہ ہے جو ابھی حال میں عرب اسرائیل جنگ کے موقع پر ہوا ہے اس لڑائی میں اسرائیل کی فتح پر یورپ اور امریکہ کے بیشتر ملکوں میں جس طرح خوشیاں منائی گئیں انھوں نے تمام تمام دنیا کے مسلمانوں کے دلوں میں زخم ڈال دیئے ہیں۔ آپ شاید ہی کوئی مسلمان ایسا پائیں گے جس نے عربوں کی شکست اور اسرائیل کی فتح پر مسیحی دنیا کے اس علی الاعلان اظہار مسرت و شادمانی کو دیکھ کر یہ محسوس نہ کیا ہو کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف مسیحیوں کے گہرے جذبۂ عناد کا مظاہرہ تھا۔ فلسطین میں اسرائیل کی ریاست جس طرح بنی ہے بلکہ بنائی گئی ہے اس کی تاریخ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ دو ہزار برس سے فلسطین عرب آبادی کا وطن تھا۔ موجودہ صدی کے آغاز میں وہاں یہودی ۸ فی صدی سے زیادہ نہ تھے اس حالت میں برطانوی حکومت نے اس کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کا فیصلہ کیا اور مجلس اقوام نے نہ صرف اس فیصلے کی توثیق کی بلکہ برطانوی حکومت کو فلسطین کا مینڈیٹ دیتے ہوئے یہ ہدایت کی کہ وہ یہودی ایجنسی کو باقاعدہ شریک حکومت بنا کر اس تجویز کو عملی جامہ پہنائے۔ اسکے بعد دنیا بھر کے یہودیوں کو لا لا کر ہر ممکن تدبیر سے فلسطین

میں بسانے کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ ۳۰ سال کے اندر ان کی آبادی ۳۳ فی صد تک پہنچ گئی۔ یہ ایک صریح ظلم تھا جس کے ذریعے سے ایک قوم کے وطن میں زبردستی ایک دوسری قوم کا وطن بنایا گیا۔ پھر ایک دوسرا اس سے بھی زیادہ ظالمانہ قدم اٹھایا گیا اور امریکہ نے کھلے بندوں دباؤ ڈال کر اقوام متحدہ سے یہ فیصلہ کرایا کہ یہودیوں کے اس مصنوعی قومی وطن کو یہودی ریاست میں تبدیل کر دیا جائے۔ اس فیصلے کی رو سے ۳۳ فی صدی یہودی آبادی کو فلسطین کا ۵۵ فی صدی اور عربوں کی ۶۷ فی صدی آبادی کو ۴۵ فی صدی رقبہ الاٹ کیا گیا۔ لیکن یہودیوں نے لڑ کر طاقت کے بل پر ۷۷ فیصدی رقبہ حاصل کر لیا اور مار دھاڑ اور قتل و غارت کے ذریعے سے لاکھوں عربوں کو گھر سے بے گھر کر دیا۔ یہ ہے اسرائیل کی اصل حقیقت۔ کیا دنیا کا کوئی انصاف پسند اور ایماندار آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ ایک جائز ریاست ہے جو فطری اور منصفانہ طریق سے بنی ہے؟ اس کا تو عین وجود ہی ایک بدترین جارحیت ہے اور اس پر مزید ظلم یہ ہے کہ یہودی صرف ان حدود کے اندر محدود رہنے پر بھی راضی نہیں ہیں جو انھوں نے فلسطین میں زبردستی حاصل کی ہیں بلکہ وہ سالہا سال سے اعلانیہ کہہ رہے ہیں کہ نیل سے فرات تک پورا علاقہ ان کا قومی وطن ہے۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ یہ قوم ہر وقت یہ جارحانہ ارادہ رکھتی ہے کہ اس پورے علاقے پر جبراً قبضہ کرے اور اس کے اصل باشندوں کو زبردستی وہاں سے نکال کر دنیا بھر میں پھیلے ہوئے یہودیوں کو وہاں لاکر بسائے اور اسی جارحانہ اسکیم کا ایک جز گذشتہ ماہ جون کا وہ اچانک حملہ تھا جس کے ذریعے اسرائیل نے ۲۶ ہزار مربع میل علاقے پر قبضہ کیا۔ اس پورے ظلم کی ذمہ دار مسیحی دنیا ہے۔ اس نے ایک قوم کے وطن میں ایک دوسری قوم کا وطن زبردستی بنوایا۔ اس نے اس مصنوعی قومی وطن کو ایک ریاست میں تبدیل کرایا۔

اس نے اس جارح ریاست کو روپے اور ہتھیاروں سے مدد دے کر اتنا طاقتور بنایا کہ وہ زبردستی اپنے توسیعی منصوبوں کو عمل میں لا سکے اور اب اس ریاست کی تازہ فتوحات پر یہی مسیحی دنیا جشن شادمانی منا رہی ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے بعد نہ صرف عربوں میں بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں مسیحیوں کی انصاف پسندی ان کی خیراندیشی اور مذہبی عناد و تعصب سے ان کی بریت پر کوئی اعتماد باقی رہ گیا ہے؟ کیا آپ کا خیال ہے کہ دنیا میں امن قائم کرنے کے یہی طریقے ہیں؟ یہ دراصل ہمارا نہیں بلکہ آپ کا کام ہے کہ مسیحی بھائیوں کو اس روش پر شرم دلائیں اور ان کی روح کو اس گندگی سے پاک کرنے کی کوشش کریں۔

(۴) اس سلسلے میں ایک زیادتی ایسی بھی ہے جو خود آپ کی طرف سے ہو رہی ہے اگرچہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ نیک نیتی کے ساتھ ہے اور آپ کو غالباً یہ احساس نہیں ہے کہ درحقیقت وہ ایک زیادتی ہے۔ میرا اشارہ آپ کی اس تجویز کی طرف ہے کہ قدیم بیت المقدس کو بین الاقوامی کنٹرول میں دے دیا جائے۔ آپ شاید یہ تجویز اس خیال سے پیش کر رہے ہیں کہ اس طرح یہ مقدس شہر لڑائی جھگڑے سے محفوظ رہے گا۔ لیکن درحقیقت اس کا نتیجہ ایک اور ظلم کی شکل میں رونما ہوگا۔ ظاہر ہے کہ بین الاقوامی کنٹرول اسی بین الاقوامی ادارے کے ہاتھ میں ہوگا جس نے اسرائیل کی یہ مصنوعی ریاست بنائی ہے اور جو آج تک اسرائیل کی کسی جارحیت کو نہ روک سکا ہے نہ اس کے ہو جانے کے بعد اس کا تدارک کر سکا ہے۔ اس ادارے کے کنٹرول میں جب یہ شہر آجائے گا تو وہ یہودیوں کے لئے بیت المقدس میں آباد ہونے کے دروازے اس طرح چوپٹ کھول دیگا جس طرح مجلس اقوام کے انتداب کے تحت برطانوی حکومت نے یہودی مہاجرین کے لئے فلسطین کے دروازے کھولے تھے اور پھر یہودیوں کو بیت المقدس کی زمینیں اور عمارتیں خریدنے کی وہی سب سہولتیں بھی فراہم کر دی جائینگی جو برطانوی انتداب اس سے پہلے فلسطین میں اس کو فراہم

کر چکا ہے۔ اس طرح تھوڑی ہی مدت کے اندر یہ شہر عملاً یہودی شہر بن جائے گا اور وہ یہودی اس پر قابض ہوں گے جن کے دلوں میں نہ مسیحی مقدسات کا کوئی احترام ہے نہ اسلامی مقدسات کا۔

میں آپ کے پیغام کے جواب میں اس طویل مراسلے اور اس صاف گوئی پر معذرت خواہ ہوں، مگر میں آپکو یہ بتانا اپنا فرض سمجھتا تھا کہ قیام امن کی اصل رکاوٹیں کیا ہیں جنھیں دور کرنے کے لئے عملاً کچھ کرنے کی ضرورت ہے اس کے ساتھ میں پھر اس بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ اگر اسلامی دنیا کی طرف سے کوئی ایسی بات ہو جسے امن عالم کی راہ میں رکاوٹ سمجھا جائے تو وہ مجھے بتائی جائے۔ مجھ کو جو تھوڑا بہت اثر دنیائے اسلام میں حاصل ہے اسے میں خود بھی اس رکاوٹ کو دور کرنے میں صرف کروں گا۔

(چٹان۔ لاہور)

مکتوبات حضرت علیؓ

اس کتاب میں نہ صرف یہ کہ حضرت علیؓ کے فصیح و بلیغ خطوط بڑی تحقیق سے جمع کئے گئے ہیں بلکہ ان کی تشریح و توضیح کا حق بھی کمال درجے میں ادا کیا گیا ہے۔ نیز ان خطوں میں جن اشخاص اور قبائل اور مقامات کا ذکر آیا ہے ان کا بھی تعارف کتاب میں موجود ہے۔

ایک صفحے پر اصل عربی خطوط دوسرے صفحہ پر ان کا نفیس اردو ترجمہ۔ لکھائی چھپائی معیاری۔ جلد پلاسٹک اعلیٰ ایڈیشن۔ قیمت ـــــ ساڑھے چھ روپے ۶/۵۰

اسلام اور عدل اجتماعی

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کا ایک مقالہ جو حج کے موقع پر موتمر عالم اسلامی کے اجتماع منعقدہ مکہ معظمہ میں پڑھا گیا۔ قیمت ۴۰ پیسے

آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام

ریڈیو، گراموفون، لاؤڈ اسپیکر، سینما، انجکشن کا طریق علاج اور اسی طرح کی جتنی نئی چیزیں ہمارے موجودہ تمدن میں ظہور پذیر ہو گئی ہیں ان کے شرعی احکام۔ سوا دو روپے ۲/۲۵

بازارِ رشوت

رشوت کسے کہتے ہیں، اس کی کتنی قسمیں ہیں۔ آج کے دورِ نامسعود میں رشوت سے کس طرح بچا جا سکتا ہے ـــــ ان سوالات کے جواب قرآن و حدیث کی روشنی میں۔

قیمت ـــــ دو روپے ۲

کراماتِ صحابہؓ

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے بعض خاص حالات و واقعات۔ قیمت ـــــ ڈیڑھ روپیہ۔

معجزہ کیا ہے؟

معجزے کی حقیقت اور سحر و طلسم وغیرہ سے اسکے امتیاز پر ایک ایمان افروز کتاب۔ قیمت ـــ ایک روپیہ ۲۵ پیسے ۱/۲۵

مجموعہ سیرتِ رسولؐ

مواد تحقیقی لیکن طرزِ تحریر اتنا سلیس اور سادہ کہ معمولی پڑھے لکھے بھی اس سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اٹھا رہے ہیں۔ بچیاں اور بچے تک اس کتاب کے ذریعے وہ ایمان افروز معلومات حاصل کر لیتے ہیں جن کا حاصل کرنا بڑی بڑی کتابوں پر موقوف ہے۔ اسی لئے اس کے ۲۵ حصے کر دیئے گئے ہیں۔ ہر حصہ چالیس نئے پیسے کا۔ آپ چاہیں تو اس کی افادیت کا اندازہ کرنے کیلئے پہلے ایک دو حصہ بھی منگا سکتے ہیں۔ کامل سیٹ دو جلدوں میں دس روپے کا ہے۔

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔ پی)

خلیل حامدی

شام کی حزب البعث

اس کی تاریخ، نظریات اور کارنامے

اسرائیل اور عربوں کی تازہ جنگ کے جو حالات اور نتائج اخبارات میں آرہے ہیں انھیں پڑھ کر ہر مسلمان کا دل انتہائی غمگین ہے ـــــ ایک طرف مسلمانوں کے آبائی علاقے چھن گئے ہیں اور دوسری طرف ان کی آبادیاں اُکھاڑی جارہی ہیں اور ان کے معصوم بچوں اور عورتوں کو نشانۂ ستم بنایا جارہا ہے۔ ان روح فرسا اور زہرہ گداز حوادث سے بیشک دنیا کا ہر مسلمان خون کے آنسو رو رہا ہے۔ اُندلس کی بربادی، ترکستان کا ضیاع اور ازبکستان اور تاجکستان کی مسلم جمہوریتوں کا خاتمہ بے شک اسلامی تاریخ کے عبرت انگیز المیے ہیں۔ مگر ۵ر جون ۱۹۶۷ء کا المیہ اس لحاظ سے گذشتہ تمام المیوں سے زیادہ پریشان کُن اور ہولناک ہے کہ اس کا نشانہ ملّتِ اسلامیہ کا قبلۂ اوّل بنا ہے جو تیسرا حرم ہے۔ گہوارۂ انبیاء ہے۔ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کی پہلی منزل ہے۔

یہ المیہ اپنے دامن میں جو نتائج و عواقب رکھتا ہے وہ پوری ملّتِ اسلامی پر اثر انداز ہونے والے ہیں۔ اس لئے ہمیں نالہ و شیون اور آہ و فریاد سے ہٹ کر ٹھنڈے دل سے ان اسباب کا جائزہ لینا چاہیئے جو اس جنگ میں عربوں کی شکست اور مغضوب علیہ قوم کی فتح پر منتج ہوئے۔ اس جنگ کے دو فریقوں یعنی مصر اور اردن کے داخلی حالات سے تو کم و بیش لوگ واقف ہو چکے ہیں مگر اس کے تیسرے فریق شام کے داخلی حالات بہت کم لوگوں کے علم میں ہیں۔

شام پر اس وقت بعث پارٹی کی حکومت ہے یہ پارٹی اگرچہ پہلے بھی حکومت میں شامل رہ چکی ہے۔ مگر ۱۹۶۳ء سے تو کلی طور پر اُس نے ملک کی زمام کار اپنے ہاتھ میں لے رکھی ہے۔ اِن صفحات میں ہم اس پارٹی کے نظریات اور کارناموں کے متعلق ضروری معلومات دے رہے ہیں تاکہ قارئین کو اندازہ ہو سکے کہ کیا یہ پارٹی شامی عوام کے اندر روحِ جہاد پھونک سکتی تھی اور شامی قوم کو اسرائیل کے مقابلے پر لا سکتی تھی؟ اسلامی فتوحات کے بارے میں جب مورخین قلم اٹھاتے ہیں تو اسبابِ فتوحات کا جائزہ لیتے وقت وہ ایران اور اُندلس اور روم و مصر کے داخلی حالات بیان کرتے ہیں۔ ان کے مذہبی تفرقوں، نظریاتی اختلافات اور حاکم گروہ کے معاشی اور اجتماعی مظالم کو اُجاگر کرتے ہیں اور اس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان داخلی اسباب کی نقاب کشائی کریں جو اسلامی فتوحات میں ممّد و معاون ثابت ہوئے

اسی طرح ہمیں جذبات اور وقتی تاثرات کے اس ہجوم میں نہایت ٹھنڈے دل سے حقائق و واقعات کی روشنی میں اُن اسباب کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو عربوں پر اسرائیل کی فتحیابی میں پنہاں ہیں۔

شام پر بعث پارٹی کا اقتدار مارچ ۶۳ء سے قائم ہے۔ اس پارٹی کے چار سالہ دورِ اقتدار کے حالات پر روشنی ڈالنے سے پہلے ضروری ہے کہ وہ تاریخی پس منظر بیان کر دیا جائے جس میں نوبت اس پارٹی کے اقتدار تک پہنچی۔ کیونکہ ماضی کے ان مجموعی حالات کو حال کی صورت گری کرنے میں دخل حاصل ہے اور ان سے واقف ہوئے بغیر موجودہ صورتِ حال کو سمجھنا مشکل ہے۔

فرانسیسی استعمار کا دور

شام پر فرانسیسی استعمار کا قبضہ تقریباً ۲۴ سال رہا ہے ۱۹۲۱ء سے لے کر ۱۹۴۵ء تک [illegible] فرانس نے اس پر حکومت کی ہے اور [illegible] تک فرانس اور برطانیہ دونوں نے مل کر وہاں رقص استبداد کیا ہے۔ فرانس نے شام کے اندر جو خطرناک ہتھکنڈے استعمال کئے انمیں سے ایک یہ تھا کہ اُس نے ملک کے اندر مسلم اکثریت کو دبانے اور اقلیتوں کو اُبھارنے کی سیاست اختیار کی۔ شام کی ۴۰ لاکھ کی آبادی میں مسلمان غالب اکثریت میں تھے اور دوسری تمام اقلیتیں چھوٹے چھوٹے گروہوں کی شکل میں تھیں۔ بڑی اقلیتوں میں نمبر ایک عیسائی تھے۔ دوسرے نمبر پر نصیری (جنھیں فرانس نے علویوں کا نام دے دیا تھا کہ اُس نفرت کو دور کیا جائے جو نصیری کے نام سے مسلمانوں میں پائی جاتی تھی) اور تیسرے درجے پر دروزی۔ نصیری سوا دو لاکھ کے قریب تھے اور دروزی ایک لاکھ سے کم۔ شہری آبادیاں زیادہ تر مسلمان تھیں۔ نصیری لاذقیہ (انطاکیہ) کے قریب ساحل پر آباد تھے اور دروزی جبل الدروز کے علاقے میں رہتے تھے جو شام اور اُردن کی سرحد پر واقع ہے۔ اِسی پہاڑ کی نسبت سے یہ دروزی کہلاتے ہیں۔ چرکس، ارمن اور یزیدی اقلیات بھی وہاں پائی جاتی ہیں مگر برائے نام، فرانسیسی استعمار نے ایک طرف مسلمانوں پر انتہائی ظلم و تشدد برتا اور انھیں پسماندہ رکھنے کی پوری کوشش کی۔ دوسری طرف اس نے ان اقلیتوں کے ساتھ بڑی شفقت کا رویہ اختیار کیا۔ سرکاری مشینری میں ان کو کلیدی مناصب دیئے۔ فوج میں ان کو زیادہ سے زیادہ داخل ہونے کا موقع دیا۔ اور ان کے دل میں مختلف ذریعوں سے مسلمانوں کے خلاف بغض بھرنے کی کوشش کی۔ مسلمان رہنماؤں نے فرانس کی اس سیاست کو بھانپ کر ہمیشہ یہ کوشش کی کہ ان اقلیات سے قومی پیمانے پر تصادم نہ ہونے پائے چنانچہ شام کی آزادی میں جن شامی رہنماؤں نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے ان میں اگر ایک طرف شکری القوّتلی (جمہوریۂ شام کے پہلے صدر جن کا ابھی حال میں انتقال ہوا ہے) اور ہاشم اتاسی جیسے جلیل القدر مسلمان ہیں تو دوسری طرف فارس الخوری جیسے محبِّ وطن مسیحی بھی ہیں۔ بدرالدین حسینی جیسے مذہبی عالم تبستی بستی اور شہر شہر گھوم کر فرانس کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے لئے جہاد کی روح پھونکتے رہے اور اُن کی آواز سے مسلم و غیر مسلم سبھی متاثر ہوتے رہے۔

شام کی آزادی کے بعد جو حکومت قائم ہوئی وہ بے شبہ صحیح وطنی حکومت کہی جا سکتی ہے۔ اس میں تمام عناصر نے کسی نہ کسی حیثیت میں حصہ لیا۔ بلکہ مسلم اکثریت کے ملک میں فارس الخوری جیسے مسیحی لیڈر بھی وزارتِ عظمیٰ کے مناصب پر فائز رہے مگر فرانس کا ناپاک استعمار اس ملک کے اندر تفرقہ اور گروہ بندی اور نسلی عصبیت کے جو بیج بو گیا تھا وہ پرورش پا رہے تھے۔ بلکہ فرانس اپنے خفیہ ذرائع سے مسلسل انکی آبیاری کر رہا تھا۔

آزادی کے بعد پے در پے انقلابات

شام کی بدقسمتی کا آغاز ۱۹۴۹ء سے ہوتا ہے جب

ملک کی جمہوری اور پُرسکون زندگی فوجی آمریت کی گود چلی گئی اور شامی فوج کے کمانڈر انچیف حسنی الزعیم نے تمام جمہوری ادارے ختم کر کے ملک میں فوجی حکومت کا اعلان کر دیا اور جنگِ آزادی کے تمام ہیرو ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے کر دیئے گئے۔

کچھ ہی عرصہ بعد ایک اور فوجی کمانڈر سامی الحنّاوی نے اٹھ کر "قوم ہی کے نام سے" غدار حسنی الزعیم کے خلاف انقلاب برپا کر دیا اور حسنی الزعیم اور اس کا وزیر اعظم محمد محسن البرازی دونوں گولی کا نشانہ بنا دیئے گئے۔ سامی الحنّاوی نے جمہوری ادارے بحال کرنے کی کوشش کی اور ملکی اختیارات وطن پرست عناصر کے سپرد کر دیئے۔

مگر فوج اختیارات اور حکمرانی کا مزہ پوری طرح چکھے بغیر رہنے والی نہ تھی۔ دسمبر ۱۹۴۹ء میں شامی فوج کے ایک کرنل ادیب ششکلی نے ملک پر فوجی یلغار کر دی اور اس کے پیش رو سامی الحنّاوی کو جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ اس پر الزام یہ تھا کہ وہ شام کو عراق کے ہاتھ بیچنا چاہتا تھا۔ آخر کار اُسے حسنی الزعیم کے وزیر اعظم محمد محسن البرازی کے قتل کے الزام میں گولی کا نشانہ بننا پڑا۔ اب ادیب ششکلی کا دورِ حکومت تھا۔ اس دور میں دسمبر ۱۹۴۹ء سے لیکر اکتوبر ۱۹۵۴ء تک شامی فوج دل بھر کر اہلِ شام کے سینے پر مونگ دلتی رہی۔ فوج اور سول کے بے شمار لوگ قتل کر دیئے گئے۔ استبداد و تشدد کا خوب دور دورہ رہا۔ ملک کی اجتماعی اور اقتصادی زندگی ڈانواں ڈول ہو گئی۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو گیا۔ قوم کے نام پر قوم کو ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی گئی۔ ادیب ششکلی نے فوج کے زیر سایہ پارلیمنٹ کا انتخاب عام کروایا اور پارلیمنٹ کی طرف سے اُسے "صدر جمہوریہ" کا منصب بھی پیش کر دیا گیا مگر شام کی تمام سیاسی اور اجتماعی اور مذہبی تنظیموں نے مل کر اس انتخاب کا مقاطعہ کیا اور متحدہ محاذ کی شکل میں ادیب ششکلی کی ڈکٹیٹر شپ کا مقابلہ کیا۔ فروری ۱۹۵۴ء کو حلب میں ششکلی کیخلاف بغاوت ہوئی اور شام سے بھاگ کر اُسے سعودی عرب میں پناہ لینی پڑی۔[1]

اس حال میں کہ ملکی معیشت کا ایک ایک بخیہ ادھڑ چکا تھا۔ ادیب ششکلی سے ملک کو نجات ملی۔ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں پھر وطنی حکومت برسرِ اقتدار آئی۔ ڈاکٹر فارس الخوری اس کے وزیر اعظم تھے۔ لیکن یہ حکومت بھی زیادہ دیر تک نہ چل سکی۔ فوجی گروہ بار بار اس میں دخل دیتے رہے۔ اسی دخل اندازی سے تنگ آ کر فارس الخوری نے استعفا پیش کر دیا۔ حالات اس قدر بگڑ چکے تھے کہ کسی دانشمند، وطن دوست اور تعلیم یافتہ شخص کے لئے انھیں سُدھارنا مشکل تھا۔ ان حالات میں جو حکومتیں بھی بنتی رہیں ان میں مشکل ہی کسی حکومت نے ایک سال سے زیادہ عرصے کی عمر پائی ہو۔

ستمبر ۱۹۵۷ء میں شام اور مصر کے درمیان ایک فوجی معاہدہ طے ہوا اور بالآخر یکم فروری ۵۸ء کو شام اور مصر میں اتحاد ہو گیا۔ دونوں ملکوں نے مل کر "متحدہ عرب جمہوریہ" کو جنم دیا مگر یہ اتحاد بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ ۱۹۴۹ء سے لیکر ۱۹۵۸ء تک ۹ سال کا عرصہ ایسا گذرا جس نے شام کے استقرار کو ہمیشہ کے لئے فارغ خطی دے دی تھی۔ اس استقرار کو ختم کرنے میں شام کی بعث پارٹی اور سوشلسٹ اور کمیونسٹ عناصر کو غیر معمولی دخل حاصل ہے۔ ان عناصر نے فوج کے اُن عناصر کو بھی غلط راستے پر ڈال دیا جو اقلیتی فرقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ زیادہ تر اُن فوجی گروہوں نے یہ بغاوتیں کیں جو حماہ اور اس کی پہاڑیوں کے رہنے والے تھے۔ یہ وہی علاقے ہیں جن میں زیادہ تر نصیری فرقہ کے لوگ آباد ہیں۔ اسی لئے شامی مورخ اِس دور کو حموی آمریت کا دور

[1] ۱۹۶۴ء میں ادیب ششکلی ایک نامعلوم شخص کے ہاتھوں یورپ میں گولی کا نشانہ بن گیا۔

کہتے ہیں۔ مصر کے ساتھ شام کے الحاق کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ شام کے ملاحدہ اور بگڑے ہوئے فوجی عناصر شام کو خالص کمیونسٹ اسٹیٹ میں تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ شامی فوج میں باہم سخت کشمکش شروع ہو گئی تھی اور ملک شدید خطرے سے دوچار ہو گیا تھا۔ اس لئے شام کے مخالف اشتراکیت حلقوں نے خیریت اسی میں سمجھی کہ مصر سے الحاق قائم کر لیا جائے کیونکہ مصر اُس وقت کھل کر روسی بلاک کا "یار غار" بن کر سامنے نہیں آیا تھا۔ مگر اتحاد کے چند روز ہی بعد قاہرہ نے پھر ان فوجی عناصر کی پشت پناہی شروع کر دی جن سے نجات پانے کے لئے شامی عوام نے یہ اتحاد قائم کیا تھا۔

شام اور مصر کا اتحاد

فروری ۱۹۵۸ء سے لے کر ستمبر ۱۹۶۱ء تک شام اور مصر کا اتحاد قائم رہا بلکہ صحیح لفظوں میں شام پر مصر کی حکمرانی رہی۔ اس دور میں شام کی صوبائی حکومت کی باگ ڈور بعث پارٹی کے لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ اتحاد کے اس دور میں قاہرہ اور بعث پارٹی نے مل کر شامی قوم کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہ یہ ہے:۔

شام میں عارضی دستور نافذ کیا گیا۔ اس دستور کے تحت تمام انتظامی اور تشریعی اختیارات صدر کو دے دیئے گئے[۱] اور بالآخر شام پر مستقل آمریت کا اعلان کر دیا گیا۔ یہ اعلان صدر کے آرڈی ننس ایکٹ نمبر ۱۶۲، ۱۷۴ مجریہ ۵۸ء کے ذریعے ہوا۔ اس اعلان کے تحت صدر اور نائب صدر کو یہ اختیارات دیئے گئے:۔

"اجتماع، نقل و حرکت، اقامت، مخصوص جگہوں پر مخصوص اوقات میں آمد و رفت کی آزادی پر پابندی، مشکوک اشخاص کو گرفتار کرنے کا حق۔ امن و امان اور ملکی نظام کے لئے خطرہ پیدا کرنے والے افراد کی نظر بندی۔ عدالتی کارروائی کے بغیر اشخاص اور مقامات کی تفتیش کی اجازت کسی بھی شخص کو کسی بھی کام کے سرانجام دینے پر مجبور کرنا۔ رسائل و اخبارات کا سنسر، ان کی ضبطی، چھاپے خانے کی ضبطی، دکانوں اور منڈیوں کو کھولنے اور بند کرنے کے اوقات کا تعین، منقولہ اور غیر منقولہ جائداد پر قبضہ کے اختیارات"[۲]

اس کے نتیجے میں پولیس ہی ملک کی اصل حکمراں بن گئی۔ پولیس کا ادارہ معاشرے اور قانون سے بالاتر ہو گیا[۳]۔ پولیس نے امن قائم کرنے کے بجائے ہنگامے اور فسادات کروانے شروع کر دیئے۔ مزدوروں کے حلقوں اور "الاتحاد القومی" کے اندر بھی پولیس نے ہنگامے کھڑے کئے[۴]۔ زرعی اصلاحات کے نام سے آتشِ انتقام بجھائی گئی[۵]۔ قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو گیا۔ اس کے نتیجے میں لوگوں نے ملک کو خیرباد کہنا شروع کر دیا۔ بعث پارٹی کی ان دھاندلیوں سے خود جمال عبدالناصر جیسا ڈکٹیٹر بھی انگشت بدنداں رہ گیا۔ ۲۲ر اکتوبر ۶۳ء کو اس نے اسکندریہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"بعث پارٹی حکومت پر ہرگز نہ آسکتی تھی۔ اس پارٹی نے تباہ کن وسائل کے ساتھ تشدد کا راستہ

---

[۱] کتاب "ماذا یجری فی سوریہ" تالیف نزار عرابی، طبع دار الفکر دمشق۔ صفحہ ۹۴ تا ۹۹ [۲] ایضاً ص ۱۱۱ [۳] کتاب "ما الذی جری فی سوریہ" تالیف محمد حسین ہیکل ایڈیٹر الاہرام ص ۸۔۲ [۴] ایضاً ص ۱۱۵ [۵] محمد حسین لکھتا ہے "حلب کے ایک زمیندار رشاد الجابری کی زمین زرعی اصلاحات کے قانون کے تحت تقسیم کی گئی۔ اس قانون کی رو سے مالک کو اپنی زمین میں سے ایک محدود مقدار اپنی مرضی کے مطابق منتخب کر لینے کا حق تھا مگر وزیر زراعت مصطفیٰ حمدون نے اُسے یہ حق استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اور جب مصطفیٰ حمدون سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے کہا کہ "یہ شخص بغداد پیکٹ کا حامی ہے" ملاحظہ ہو کتاب ما الذی جری فی سوریہ ص ۹۷۔۹۸۔

اختیار کیا۔ خونریزی کو مشغلہ بنایا۔ بعث کا نظام فاشسٹ نظام ہے۔ یہ عوام کی نمائندگی سے محروم ہے۔ بعث حکومت کی بنیاد خونریزی، تشدد اور جیل خانوں پر قائم ہے[۱]۔"

اس دور میں بعث پارٹی کی حکومت نے ایک ایسا کارنامہ سرانجام دیا جس سے یہ بخوبی اندازہ ہوگیا کہ مسلمانوں کے حق میں اس پارٹی کے کیا عزائم ہیں۔ یوگوسلاویہ کے مسلمانوں کی ایک تعداد وہاں کی کمیونسٹ حکومت کے مظالم سے تنگ آکر شام میں پناہ گزین تھی ۱۹۴۹ء کی جنگ فلسطین میں ان مسلمانوں نے بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا اور کارہائے نمایاں انجام دیئے ۱۹۵۹ء میں جب مارشل ٹیٹو نے متحدہ عرب جمہوریہ کا دورہ کیا تو اس نے ان پناہ گزیں مسلمانوں کو واپس یوگوسلاویہ بھیجنے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ بعث حکومت نے یہ تمام مسلمان خفیہ پولیس کے حوالے کردیئے۔ لاذقیہ کی بندرگاہ سے انکو بحری جہاز میں لاد دیا گیا اور وہاں سے یوگوسلاویہ پہنچا دیئے گئے۔ یوگوسلاویہ میں انھیں یک قلم موت کے گھاٹ اتار دیا گیا[۲]۔

اتحاد کا خاتمہ

بعثی اور اشتراکی عناصر کی دھاندلیوں اور قاہرہ کی بے تدبیریوں کی وجہ سے مصر اور شام کا اتحاد ۳ سال ۷ ماہ کے اندر ختم ہوگیا۔ حماہ کے ایک فوجی نوجوان حیدر الکزبری نے شام کو مصر سے کاٹ دیا اور مصریوں کو ملک سے نکال دیا۔ شام کے ایک ایک فرد نے اس اتحاد کے انقطاع پر خوشی کے شادیانے بجائے۔ ملک کے اندر سول حکومت قائم کردی گئی۔ اجتماعی اور اقتصادی زندگی میں چہل پہل شروع ہوگئی۔ علیحدگی کے تھوڑے عرصے بعد پارلیمنٹ کا انتخاب عمل میں آگیا۔ ناظم القدسی جیسے سرنجام رخ لیڈر سربراہ منتخب ہوئے نئے دستور کی تدوین کا آغاز ہوگیا لیکن وہ عنصر جو جمہوری ماحول میں اپنی موت سمجھتا ہے اس نئے دور سے ناخوش تھا۔ کیونکہ جمہوری انتخاب نے یہ ثابت کردیا کہ وہ تمام نعرے جو بعث ازم نیشنلزم اور کمیونزم کے نام پر لگائے گئے ہیں اور انھیں "پسماندہ عوام" کے مقبول ترین نعرے قرار دیا جاتا رہا تھا۔ عوام نے ان سے بیزاری کا اظہار کردیا ہے اور آزادانہ انتخاب کے پہلے ہی مرحلے میں ان کی قلعی کھل گئی ہے۔ چنانچہ چند طالع آزما لیڈروں نے فوج کے اُن افسروں سے راہ و رسم پیدا کی جو خود حکومت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ اس طرح سے شام پھر ایک اور تاریک شام کا استقبال کرنے لگا۔ اس کے بعد حالات میں جو تغیر ہوا اُس کا خلاصہ یہ ہے:-

پے در پے فوجی انقلابات

۲۸ مارچ ۱۹۶۲ء کو تین فوجی افسروں، عبدالکریم نحلاوی، مہیب الہندی اور ہشام نے مل کر دمشق پر ٹینکوں سے چڑھائی کردی۔ ان میں ایک دستہ وہ تھا جو اسرائیلی سرحد پر متعین تھا۔ ان افسروں کی یہ تحریک جس کے پیچھے بعثی اور اشتراکی سول افسروں کا بھی ہاتھ تھا اس لحاظ سے انتہائی تباہ کن تھی کہ شام جمہوریت کے راستے سے ہٹ کر پھر عسکری آمریت کے پنجے میں جارہا تھا۔ انقلابیوں نے تمام سیاست دانوں کو المزہ کی جیل میں ڈال دیا۔ اور نہاد القاسم نے نئی مخلوط وزارت تشکیل کی جس میں فوج اور سول کے وزراء شامل کئے گئے۔

ابھی اس حکومت نے "ہنی مون" بھی نہ منایا تھا کہ دو ہفتے کے بعد جاسم علوان اور لوئی اتاسی اور اُن کے رفقاء نے بغاوت کردی۔ شام کے شمالی علاقے

---

[۱] سقوط الثورات الاشتراکیہ ص ۱۳۳-۱۳۵۔ [۲] کتاب سقوط الثورات الاشتراکیہ، مطبوعہ لبنان ص ۱۱۹-۱۲۰ نیز ملاحظہ ہو ماہنامہ حضارۃ الاسلام دمشق، شمارہ نومبر ۱۹۶۲ء و روزنامہ الندوہ، مکہ بیان محمود کمال مفتش۔ البتہ مارشل ٹیٹو نے پچاس ہزار یہودی اسرائیل بھیجے ہیں جن میں اس کا بھائی ناحوم بیادہ بھی ہے اور وہ وزارت خارجہ میں اہم عہدے پر کام کر رہا ہے ۱۲

سے یہ تحریک اٹھی۔ ناصر کے حامیوں نے اس کی تائید کی اور "وحدتِ مصر و شام" کو نئے سرے سے بحال کرنے کی کوشش کی گئی۔ بشیر العظمہ کی حکومت نے بالفعل اس کا اعلان بھی کر دیا مگر دمشق اور قاہرہ کی گفتگوئیں نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئیں۔ قاہرہ نے سرد مہری کا برتاؤ کیا۔ عبدالکریم نحلاوی اور اس کے ساتھی ملک سے باہر نکال دیئے گئے اور ابھی تک وہ جلاوطن ہیں۔ ملک کے اندر خلفشار نے تباہ کن صورت اختیار کر لی۔

ملک کی کشتی کو بھنور کے بیچوں بیچ دیکھ کر سابقہ پارلیمنٹ نے خود بڑھ کر ہمت کی۔ مرحوم خالد العظم کے مکان پر اس کا اجلاس ہوا۔ پارلیمنٹ نے خالد العظم پر اعتماد کا اظہار کیا اور ان کی سرکردگی میں نئی حکومت کی تشکیل کر دی گئی۔ نئے دستور کی تدوین پر وقت صرف کرنے کے بجائے ۱۹۵۰ء کے دستور کو نافذ کر دیا گیا۔ یہ وہی جمہوری دستور تھا جسے وطن پرست عناصر نے فرانس سے نجات کے بعد وضع کیا تھا اور شام کے پہلے فوجی ڈکٹیٹر حسنی الزعیم نے جسے بوٹوں تلے روند ڈالا تھا۔ ایمرجنسی ختم کر دی گئی۔ بنیادی آزادیاں بحال کر دی گئیں مگر ماحول کی خوشگواری سے فائدہ اٹھا کر شر پسند عناصر نے فتنہ پردازی شروع کی بازاروں اور شاہراہوں پر بم پھینکے گئے۔ فضا کو معمول سے ہٹانے کے لئے جگہ جگہ دہشت پسندانہ سرگرمیوں کا آغاز کر دیا گیا۔ شام کے تمام اہلِ علم، اربابِ سیاست اور مذہبی اور سوشل تنظیموں کے لیڈر اس امر پر متفق تھے کہ ملک کو کسی نہ کسی طرح آمریت کی طرف جانے سے بچایا جائے۔ اکرم حورانی جیسے اشتراکیت نواز بھی اس میں پیش پیش تھے۔ چنانچہ ایک نیشنل چارٹر وضع کیا گیا جس میں ملک کے ہر حلقے کی نمائندگی تھی۔ ۸ مارچ ۱۹۶۳ء کو شام ریڈیو سے اس چارٹر کا اعلان ہونے والا تھا۔

بعث پارٹی کی حکومت

ٹھیک ۸ مارچ ۱۹۶۳ء کی صبح کو ایک فوجی افسر زیاد الحریری کی قیادت میں ایک اور فوجی انقلاب برپا کر دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ قاہرہ کے حامیوں نے اس انقلاب کا تانا بانا تیار کیا تھا مگر زیاد الحریری اور فوج کے بعثی عناصر اسے لے اڑے۔ شروع میں انقلابی حکومت میں ناصریوں کو بھی شامل کیا گیا مگر رفتہ رفتہ بعثی گروہ نے جو دروزیوں اور علویوں پر مشتمل تھا۔ تمام ناصریوں کو نکال دیا اور خالص بعثی حکومت کا طوطی بولنے لگا۔ شام کے اندر اس دور میں سخت افسوسناک حالات رونما ہوئے۔ بعثی کارکنوں نے عوام الناس پر دست درازیاں کیں۔ دمشق اور حماہ اور حمص میں سیکڑوں افراد شہید کئے گئے۔ مسلمانوں نے اقلیتی فرقے کی حکومت کے خلاف احتجاج کیا۔ مسجدوں اور عبادت گاہوں میں اس کے خلاف آواز اٹھائی گئی مگر بعث کی فوجی حکومت نے دل کی پوری بھڑاس نکالی۔ دمشق کی مشہور تاریخی مسجد جامع اموی پر گولہ باری کی اور عین حالتِ نماز میں نمازیوں کو شہید کیا۔ حماہ کی جامع مسجد میں بھی جب مسلمانوں نے پناہ لی تو فوج نے مسجد کے اندر گھس کر لوگوں کو پکڑا اور انھیں سرِ بازار سزائیں دیں۔ اسلام پسند عناصر کے ساتھ انتہائی وحشیانہ برتاؤ کیا۔ ان کی داڑھیاں نوچی گئیں۔ ناخن اکھاڑے گئے اور طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ سیاسی بے دخلی بھی شروع ہو گئی۔ ریاست دانوں کی فہرستیں باہر سے چھپ کر آتی تھیں اور شام میں ان پر عمل درآمد ہوتا تھا۔

اس طرح بعث پارٹی کی حکومت کا دور مارچ ۶۳ء سے شروع ہوا۔ اس پارٹی نے آج تک جو مہمات سرانجام دی ہیں اُن کا جائزہ لینے سے پہلے اس پارٹی کی تاریخ، اس کے نظریات اور اس کے بعض لیڈروں کا تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بعث پارٹی کا بانی

بعث پارٹی ۱۹۴۰ء میں وجود میں آئی تھی۔ اس نے

اپنے چھبیس سالہ دور میں اسلام کی مخالفت میں کوئی کمی نہیں اٹھا رکھی۔ عرب قوم پرستی، اتحاد اور اشتراکیت کی آڑ میں اس نے الحاد اور انارکی کی اشاعت کی ہے اس پارٹی کا بانی ایک عیسائی مائیکل عفلق[1] ہے۔ یہ شخص ۱۹۲۸ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک فرانس میں تعلیم حاصل کرتا رہا ہے۔ شام کی فرانسیسی حکومت نے اسے خاص طور پر تعلیمی مشن کے ہمراہ بھیجا تھا۔ فرانس سے واپس آیا تو اسے دمشق کے مدرسۃ التجہیز الاولیٰ میں اسلامی تاریخ کا مدرس مقرر کیا گیا۔ یہ مدرسہ ثانوی تعلیم کے معیار کا تھا۔ تدریس کے زمانے میں اس نے طلبہ کے اندر اپنے بیہودہ نظریات و افکار کی اشاعت شروع کر دی اور ان کے ذہنوں میں یہ نظریہ اُتارنا شروع کر دیا کہ اسلام خالصتہً عربوں کی تحریک تھی۔ غیر عربوں نے اس میں شامل ہو کر اسے بگاڑ دیا ہے۔ اسلام کے مخالفین جنھیں مشرکینِ عرب کہا جاتا ہے محض اپوزیشن لیڈر تھے انھوں نے بھی اس تحریک کی کامیابی کے لئے اتنا ہی حصہ لیا جتنا اس تحریک کی موافق پارٹی نے لیا۔ اور یہ کہ جو قرآن عثمان رضی اللہ عنہ نے جمع کیا ہے وہ اُس قرآن سے مختلف ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا[2] علمائے اسلام کے کانوں تک جب یہ ہفوات پہنچیں تو انھوں نے وزارت تعلیم سے سخت احتجاج کیا۔ جس کے نتیجے میں وزیر تعلیم نے فوری کارروائی کی اور تاریخ اسلامی کے بجائے اس شخص کو فرانسیسی زبان کی تعلیم کا استاد بنا دیا گیا۔ مذکورہ بالا مدرسہ دمشق کا وہ واحد مدرسہ تھا جو فرانسیسی تسلط کے اثر سے آزاد تھا۔ اس مدرسے میں شام کے نمایاں لوگوں کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مائیکل عفلق نے اس مدرسے کے نوخیز ذہن کو اپنی آماجگاہ بنائے رکھا۔ طلبہ کو فرانس میں تعلیم کی سہولتیں دلوانے کا لالچ دے کر اپنے جال میں پھنساتا رہا اور ان کے اندر دینی روایات کے خلاف بغاوت کا جذبہ اُبھارتا رہا اور بعض اچھے اچھے دینی گھرانوں کے نوجوانوں کو بھی اُس نے اپنے خیالات سے متاثر کر لیا۔

۱۹۴۲ء میں مائیکل عفلق نے مدرس سے استعفا دے دیا اور اپنی پارٹی کی تنظیم شروع کر دی ۱۹۴۹ء میں جب حسنی الزعیم نے پہلی مرتبہ شام کے اندر فوجی آمریت قائم کی تو مائیکل عفلق کو وزارتِ تعلیم کا قلمدان سونپا گیا۔ چنانچہ اس منصب سے اُس نے پورا فائدہ اُٹھایا۔ اپنے کئی پیروکاروں کو تعلیم کے لئے فرانس بھجوایا۔ اس کے حامیوں نے تعلیمی اداروں کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور اپنے مدرسین کو مختلف اسکولوں میں پھیلا دیا۔ شام کے کالج آف ایجوکیشن اور ٹیچرز ٹریننگ سنٹر انھوں نے کلیتہً اپنے قبضے میں لے لئے اور حالت یہ ہو گئی کہ ہر اُس طالب علم کے لئے انھوں نے ان اداروں کے دروازے بند کر دیئے جس کے اندر سے ایمان باللہ اور اسلام سے وابستگی کی بو آتی تھی۔ اسی طرح ملٹری کالج پر بھی ان کا مکمل تسلط ہو گیا اور وہاں بھی کسی مومن کے لئے داخلے کی گنجائش انھوں نے نہ چھوڑی۔ البتہ غیر مسلم اقلیتوں کے افراد اور علوی اور دروزی اور وہ مسلمان نوجوان جنھوں نے اسلام اور عقیدۂ اسلام کو فارغ خطی لکھ دی۔ ان اداروں سے خوب فائدہ اٹھاتے رہے۔ ان سے فارغ ہو کر جو نوجوان نکلے، ان میں سے اکثر و بیشتر عفلق کے نظریات کے پُرجوش داعی بن کر نکلے۔ یہ اُسی دور کا قصہ ہے کہ کالج آف ایجوکیشن کے طلبہ کے ایک گروہ نے (نعوذ باللہ) خدا کا جنازہ نکالا تھا۔ اور ابوجہل اور ابولہب کے نام سے تفریحی کلب قائم کئے تھے

مائیکل عفلق نے اسلام کے بارے میں جو رویہ اختیار کیا وہ اس کی ان تحریروں سے واضح ہے جو آگے ہم نقل کر رہے ہیں۔ لیکن مسیحیت میں اُس کی پختہ زناری کا یہ عالم رہا کہ اس نے باقاعدہ ویٹیکن میں حاضر ہو کر پوپ کی زیارت کی اور اس سے ایک تمغہ حاصل کیا۔ فرانسیسی

---

[1] ہمارے ملک کے اخبارات عموماً اس کو افلاک لکھتے ہیں حالانکہ اس کا صحیح نام عفلق ہے۔ [2] باطنیہ کی ہر تحریک نے اپنے زمانے میں یہی خیال پیش کیا ہے کہ موجودہ قرآن اصل قرآن نہیں ہے۔ اصل قرآن [illegible]

گورنر سے بھی (جو اُس وقت شام اور لبنان کے دونوں صوبوں کا گورنر تھا) اس کے گہرے روابط تھے۔ گورنر کا مرکز بیروت میں تھا۔ ایک مسلمان فوجی افسر جسے فرانسیسی عہد میں غیر معمولی منصب حاصل تھا اور جو فرانسیسی گورنر کے محل میں تعینات تھا، بیان کرتا ہے کہ اس زمانے میں عفلق اور فرانسیسی گورنر کے درمیان طویل خفیہ ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں اور ان ملاقاتوں میں نہایت اہم اُمور پر مشورے ہوتے رہتے تھے۔[۵۱]

بعث پارٹی کے اصل حامی

مسلمان طلبہ کے اندر مائیکل عفلق کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکی۔ بے شک اُس نے بعض اچھے مذہبی گھرانوں کے نوجوانوں کو خراب کیا۔ لیکن علماء کے واویلا اور احتجاج کی بناء پر اُس نے اپنی دعوت کا رُخ بدل دیا اور صرف اقلیتی فرقوں کے طلبہ پر اپنی توجہات مرکوز کر دیں۔ وزارت تعلیم سے مستعفی ہو کر اُس نے پارٹی کی توسیع کے لئے دروزی قبائل اور نصیری یعنی علوی آبادیوں کا دورہ کیا۔ یہ دونوں قبائل قریب قریب یکساں عقائد رکھتے ہیں اور مسلمانوں کی عداوت پر متفق ہیں۔ فرانس نے اپنے دورِ انتداب میں اِن فرقوں کو مسلمانوں کے خلاف اُبھارنے کی پوری کوشش کی ہے۔[۵۲] مائیکل عفلق نے اسی عصبیت سے فائدہ اٹھا کر ان دونوں فرقوں کے لئے بعث پارٹی کے دروازے کھول دیئے اور ان کے ذریعے سے شامی فوج کے اندر اپنے خفیہ حلقے قائم کر لیئے۔ ہمارے ملک کے بعض لوگ بعث پارٹی کو مسلمانوں کی کوئی جماعت سمجھتے ہیں حالانکہ اس پارٹی کی زمامِ کار عیسائیوں، دروزیوں اور نصیریوں کے ہاتھ میں ہے۔ البتہ چند ملحد مسلمان ضرور اس میں شامل ہیں مگر ان کی حیثیت دوسرے درجہ کی ہے۔ محض مسلم دنیا کو دھوکہ دینے کے لئے انھیں چند سرکاری منصب سونپے گئے ہیں۔

نصیری اور دروزی ہمیشہ مسلمانوں سے شدید عداوت برتتے رہے ہیں۔ صلیبی جنگوں میں انھوں نے عیسائیوں کی پوری پوری مدد کی۔ صلیبی لشکر کو شام کے علاقوں میں گھسنے کا انھوں نے نہ صرف موقع دیا بلکہ پوری رہنمائی کی۔ تاتاری بھی انھی کی امداد سے بلادِ اسلام میں داخل ہوئے۔ بلادِ اسلام پر ہر حملہ آور کی یہ جاسوسی کرتے رہے۔ بحرین پر جب ان کو اقتدار حاصل ہوا تو اس وقت بھی انھوں نے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائیں اور حج کے ایام میں مکہ معظمہ پہنچ کر انھوں نے حجاج کی کثیر تعداد کو قتل کیا اور انھیں چاہِ زمزم میں پھینک دیا۔ حجرِ اسود کو توڑ ڈالا۔ علمائے اسلام اور مسلمانوں کی نمایاں شخصیتوں کی اَن گنت تعداد ان کے ہاتھوں شہید ہوئی اور اب نئے دورِ اقتدار میں انھوں نے مسلمانوں کے گوشت و خون اور سلب و نہب میں پچھلے تمام ریکارڈ مات کر دیئے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں جو مسلمان فلسطین سے ہجرت کر کے نکلے تھے ان کا بیان ہے کہ اسرائیلی فوج کے یہودیوں نے ان پر وہ مظالم نہیں ڈھائے جو دروزیوں نے ڈھائے۔ دروزیوں کی تازہ ترین غدّاری عربوں اور اسرائیل کی حالیہ جنگ میں بھی ثابت ہو چکی ہے۔ روزنامہ جنگ میں محمود احمد مدنی لکھتے ہیں:-

> "شام کی تیز رفتار پسپائی کا ایک المناک پہلو یہ ہے کہ عین جنگ کے دوران اسرائیل سے متصل شام کی سرحد پر آباد دروزی قبائل نے اسرائیل سے وفاداری کا اعلان کر دیا۔ دروز شام کی ایک اہم اقلیت ہیں۔ شام کی خانہ جنگیوں میں ان کا ہمیشہ ہاتھ رہا ہے۔"[۵۳]

بہر حال یہی دروزی اور علوی (نصیری) شام کی بعث پارٹی کے روحِ رواں رہے ہیں۔ انھی کی ریشہ دوانیوں سے وہاں جمہوریت نہیں چل سکی اور بار بار انقلابات برپا ہوتے رہے۔

---

۵۱ ملاحظہ ہو ہفت روزہ اخبار العالم الاسلامی۔ مکہ، شمارہ ۵ رجون ۱۹۶۷ء ۵۲ کتاب "فی سبیل البعث" از مائیکل عفلق ص ۲۰۔

۵۳ ملاحظہ ہو روزنامہ جنگ بابت ۲۰ رجون ۱۹۶۷ء مکتوب محمود احمد مدنی۔

بعث کے نظریات

اب ہم مائیکل عفلق اور بعث پارٹی کے دوسرے لیڈروں کی تحریروں کی روشنی میں اس پارٹی کے نظریات کا جائزہ لیتے ہیں۔ مائیکل عفلق نے بعث کے تین مقاصد بیان کئے ہیں۔ وحدت، حریت اور اشتراکیت۔ وحدت کا مفہوم وہ یہ بتاتا ہے کہ:۔

"عربوں کی مذہبی اور ملی اساسات کو ختم کر کے انھیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا۔"[۵۱]

حریت کا مفہوم یہ ہے کہ:۔

"اسلام محض ایک مذہب ہے اس میں اور دوسرے مذاہب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ عرب ریاست کے اندر ہر شہری کو عقیدے کی آزادی ہوگی۔"[۵۲]

اشتراکیت کا تصور یہ ہے کہ:۔

"میری اشتراکیت یہ نہیں ہے کہ کارخانوں میں اضافہ ہو۔ میری اشتراکیت یہ ہے کہ "زندگی کی دولت" میں اضافہ ہو۔ اصل بات یہ نہیں ہے کہ لوگ طعام میں مساوی ہوں۔ اصل چیز یہ ہے کہ ہر فرد اپنے خیالات و افکار کے اظہار میں مکمل آزاد ہو۔"[۵۳]

اس اشتراکیت کے عزائم وہ یہ بتاتا ہے کہ:۔

"وہ ان "کمزور انسانوں" کی کایا پلٹنے والی ہے جو مصائب کا مقابلہ آہ و بکا سے کرتے ہیں اور یہ کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔"[۵۴]

اشتراکیت کے نفاذ کا طریقہ اس کے نزدیک یہ ہے کہ:۔

"ہم اشتراکیت کو کیسے نافذ کریں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شام کی حکومت پر جب ہمارا قبضہ ہو جائے گا تو ہم تمام تفریقوں کو مٹا دیں گے اور "عدل" کو بروئے کار لائیں گے۔ لیکن بایں ہمہ ہم باقیماندہ مشن کی تکمیل میں مصروف رہیں گے ہو سکتا ہے ہم شامی قوم کی ہر خواہش پوری نہ کر سکیں۔ بلکہ ہم اس کی ضروریات میں سے کچھ تو وصول ہی کریں گے تاکہ فوج کی پرورش کر سکیں اور تمام عرب ملکوں کے اندر انقلاب برپا کر سکیں۔"[۵۵]

"اس کشمکش سے اس وقت تک کوئی جوہری انقلاب برپا نہیں ہوگا جب تک اسکی بھاری قیمت نہ ادا کی جائے۔"[۵۶]

اسلام کے بارے میں بعث کا تصور

بعث پارٹی کے بانی نے اسلام کو عربوں کی تحریک قرار دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک عرب لیڈر قرار دیا ہے اور اسلام کو آسمانی پیغام نہیں بلکہ عربوں کی طبعی بیداری سے تعبیر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے:۔

"اسلام کی تحریک عربوں کے مزاج اور طبیعت کا عکس ہے اس لحاظ سے اسلام کے حروف اور شکلیں چاہے نہ بدلیں مگر اسلام کی روح بدلتی رہتی ہے۔ اب تک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو باہر سے دیکھا گیا ہے اور ایک خوشنما شکل سامنے رکھی گئی ہے اور تقدیس اور شیفتگی کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے لیکن اب ہمیں اندر سے بھی دیکھنا چاہئے۔"[۵۷]

"اسلام کا کارنامہ اس طبعی اسٹیج سے الگ نہیں کیا جا سکتا جس پر یہ ظہور پذیر ہوا ہے اور وہ اسٹیج ہے سرزمین عرب۔ اور نہ اس کارنامے کے ہیرو اور ایکٹر اس سے الگ کئے جا سکتے

---

۵۱ کتاب۔ فی سبیل البعث تالیف مائیکل عفلق ص ۱۴۲ ۵۲ ایضاً ص ۱۴۳ ۵۳ ایضاً ص ۲۱ ۵۴ ایضاً ص ۱۸
۵۵ ایضاً ص ۹۹ ۵۶ ایضاً ص ۱۱۴ ۵۷ گویا یہ باطنیت کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

ہیں۔ اور وہ ہیں تمام عرب۔ اس کارنامے کے لئے جس طرح مومنین کی ضرورت تھی اسی طرح مشرکین عرب کی بھی ضرورت تھی۔ بظاہر اسلام سے جن لوگوں نے محاربہ کیا ہے در اصل انھوں نے اس کارنامے کو کامیاب کرنے میں اتنا ہی حصہ لیا ہے جتنا اُس کے حامیوں اور مددگاروں نے لیا۔ لہٰذا اسلام ایک عرب قومیت کی تحریک تھی۔ اس کا مقصد عرب قومیت (عروبہ) کی تجدید و تکمیل تھی۔ چنانچہ اسلام کی زبان عربی ہے اور حالات کے بارے میں اسلام کا مطالعہ عربی ذہن کی عینک سے تھا۔ اسلام نے جن فضائل اور اوصاف کو بیان کیا ہے وہ سب عربوں کے فضائل اور اوصاف تھے۔ جس طرح آج ہم بعض افراد کو "وطن پرست" اور "قوم پرست" کہتے ہیں اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ افراد اُس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جو وطن اور قوم کے لئے کام کر رہا ہے۔ اسی طرح اُس زمانے میں مسلم اُس عربی کو کہتے تھے جو عرب قومیت کی اس تحریک سے وابستہ تھا۔"[۵۱]

عرب قومیت کے بارے میں بعث کا نقطۂ نظر

مائیکل عفلق لکھتا ہے:۔

"عرب قوم بیدار ہو رہی تھی کہ اسلام کا پیغام پہنچ گیا بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت عربوں کے اندر جو بیداری کی رو چلی تو اسلام نے فقط اُسی بیداری کو بیان کیا ہے اس لئے اسلام عرب قوم کے سوا کسی دوسری قوم میں عکس پذیر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسلام عربوں کی خوبیوں، عربوں کے اخلاق اور عربوں کی صلاحیتوں سے عبارت ہے۔ لہٰذا اسلام یہی ہے کہ عرب طاقتور ہوں اور حکمرانی ان کے ہاتھوں میں ہو۔ اسلام کی طاقت آج نئے مظہر میں وارد ہو رہی ہے اور وہ ہے عرب قومیت۔"[۵۲]

"یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم نماز بھی پڑھیں اور روزے بھی رکھیں۔ لیکن ہم اللہ پر ایمان رکھیں۔ ہمارا اسلام موروثی یا تقلیدی نہیں ہے بلکہ ترقی پسند ہے۔"[۵۳]

عرب تحریک کی تاریخ بیان کرتے ہوئے عفلق لکھتا ہے:۔

"عرب قوم نے متعدد اوقات میں مختلف طریقوں سے اپنی زندگی اور ذات کا اظہار کیا ہے۔ کبھی حمورابی کے قانون کی شکل میں، کبھی جاہلی شاعری کے رنگ میں، کبھی دین محمدؐ کے اندر، کبھی عہدِ مامون کے کلچر میں۔ ان تمام شکلوں میں احساس اور شعور ایک ہی رہا ہے اگرچہ زمانے مختلف رہے ہیں۔ عرب قوم کی حالیہ بیداری اور ترقی آج ہی کی پیداوار نہیں ہے بلکہ اس کے رشتے ہزارہا سال پہلے کی تاریخ سے وابستہ ہیں۔"

"بعث کا نظریہ کبھی کبھی ماضی کا قصہ بھی چھیڑ دیتا ہے۔ لیکن اُسے ماضی میں کوئی کمال نظر نہیں آتا۔ ماضی ایک مرحلہ تھا جو واپس نہیں آ سکتا اور نہ لایا جا سکتا ہے۔ بعث پارٹی کسی مخصوص نظریئے کی علمبردار نہیں ہے نہ کسی مصنوعی خیال کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے۔"[۵۴]

"عرب قوم آج وسیع تہذیبی میراث کی مالک ہے۔ اس میراث میں کئی تہذیبیں شامل ہو چکی ہیں اور باہم اثر انداز ہو چکی ہیں مصری تہذیب، آشوری تہذیب، فینیقی تہذیب سب اس میں شامل ہیں۔ جب ہم عرب قومیت کا نام

---

۵۱ فی سبیل البعث ص ۴۵ و ۴۶ ۵۲ ایضاً ص ۴۷ و ۴۸ ۵۳ ایضاً ص ۵۲ ۵۴ ایضاً ص ۷۷ و ۷۸ ۔

لیتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم فراعنہ کی تہذیب اور میراث کا انکار کرتے ہیں یا اس سے برائت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ سطحی انداز فکر ہے۔ عرب قومیت کسی بھی انسانی تہذیب سے الگ چیز نہیں بلکہ تمام تہذیبوں کا مرکب ہے[۵۱]"

عفلق کی نظر میں دین کی حقیقت

دین کے بارے میں عفلق کے خیالات ملاحظہ ہوں:-

"مشکل یہ ہے کہ دین کی حقیقت اور دین کے ظاہر میں فرق ہے۔ اس لئے کہ دین کا ایک باطن ہوتا ہے اور ایک ظاہر اور بعض اوقات یہ فرق باطن اور ظاہر میں تناقض کی حد تک پہنچ جاتا ہے[۵۲]"

اسرائیل کے متعلق اس کا نقطۂ نظر

اسرائیل کے بارے میں عفلق کہتا ہے:-

"اسرائیل کا وجود ایک نفس الامری حقیقت ہے ہمیں اس امر کا پورا پورا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ فنی قابلیت کے لحاظ سے اسرائیل ترقی یافتہ ریاست ہے اس کے مقابلے میں عرب معاشرہ پسماندہ ہے اور اس پر رجعت پسندوں کی چھاپ لگی ہوئی ہے اس چیز نے اسرائیل کو اس علاقے کی ترقی یافتہ ترین ریاست بنا دیا ہے۔ چنانچہ وہ اب مشرق کے اندر مغرب کی تہذیب کا نیا تجربہ کر رہا ہے۔ یہ تجربہ حوصلہ افزائی اور تحفظ کا مستحق ہے[۵۳]"

بعث پارٹی کا منشور

یہاں تک ہم نے بعث پارٹی کے بانی مائیکل عفلق کے خیالات پیش کئے ہیں جو اس نے خود اپنی کتابوں میں ظاہر کئے ہیں۔ اب ہم آپ کے سامنے اس پارٹی کے منشور میں سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں جن میں اسلام کے بارے میں بعث کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے:-

"رجعت پسند[۵۴] ان تمام قوانین کو جو ہمارے پچھلے قومی انقلاب[۵۵] میں پیش کئے گئے تھے سرمدی اور ابدی حل کہتے ہیں اور انھیں ہر زمانے اور ہر ملک کے لئے مفید قرار دیتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ نے ایک مرتبہ تو ان قوانین کے ذریعے سے عرب قوم کو بچایا اور اب وہ انھی قوانین کے ذریعے سے جو بوسیدہ ہو چکے ہیں، عرب قوم کا گلا گھونٹنا چاہتا ہے[۵۶]"

"بیسویں صدی کی عینک سے جب ہم پچھلی تہذیبی روایات کو دیکھتے ہیں تو ہمیں وہ بالکل بیج اور ناکارہ نظر آتی ہیں۔ ان کا بیسویں صدی کی انسانی سوسائٹی سے ہم آہنگ ہونا محال ہے۔"

"زندگی کی نئی تشکیل کے لئے تم دکھ مرجاؤں سے خطاب ہے) جتنے حل پیش کرو گے رجعت پسند انھیں جدید اور علمی ماننے کے باوجود بشری حل کہیں گے۔ لیکن اسلام کے اندر جتنے قوانین بیان کئے گئے ہیں وہ ان کی نگاہ میں الٰہی قوانین ہیں۔ کامل اور اٹل ہیں۔ ہر قوم اور ہر زمانے

---

[۵۱] ایضاً ۲۱۳ [۵۲] ایضاً ص ۲۰۰ عفلق کا یہ نظریہ بعینہٖ وہی نظریہ ہے جو باطنیہ نے اختیار کیا تھا۔ قرامطہ اور حسن بن صباح کے پیرو اسی نظریئے کے علمبردار تھے [۵۳] ایضاً ص ۲۲۷ [۵۴] منشور میں اسلام پسند عناصر کو رجعت پسند کہا گیا ہے۔ [۵۵] اس قومی انقلاب سے مراد وہ انقلاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا کیا تھا بعث پارٹی اس انقلاب کو عربوں کے سابق انقلاب سے تعبیر کرتی ہے۔ [۵۶] یعنی اب اگر عربوں نے اسلام کی پیروی پر اصرار کیا تو وہ مر جائیں گے اور تباہ و برباد ہو جائیں گے۔

کے لئے موزوں ہیں۔ اس لئے جدید قوانین سے برارت کا اظہار کرنا چاہیئے۔ لیکن بعث رجعت پسندوں کے اس فریب میں نہیں آئے گی۔"

"اسلام تو صرف زکوٰۃ، صدقات اور دوسروں پر احسان دھرنے کا "سوشلزم" پیش کرتا ہے مگر "عرب سوشلزم" سرے سے غربت اور نفع اندوزی کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ سرزمین عرب میں ایک انسان بھی ایسا نظر نہ آئے گا جسے کسی کے احسان، صدقہ، شفقت ورحمت اور مہربانی اور کرم نوازی کی ضرورت ہو۔"

"ہمارے اور رجعت پسندوں کے درمیان یہی فرق ہے۔ ہمارا نظریہ زندگی بخش اور سائنٹفک ہے۔ جوہر اور ماہیت اس کا ہدف ہے۔ اس کے مقابلے میں رجعت پسندوں کا موقف مردہ اور جامد ہے مستقبل کی بربادی ہے اور شکلیں اور چھلکے اس کا ہدف ہے۔ یہ لوگ تمام صلاحیتوں کو ماضی کی بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں[1]۔"

بعث پارٹی کا مذہب پر تازہ ترین حملہ

بعث پارٹی کی ایک تازہ ترین تحریر کے بھی ہم ضروری حصے نقل کر دیتے ہیں۔ یہ تحریر اسرائیل کے حالیہ حملے سے صرف ایک ماہ پیشتر منظر عام پر آئی تھی۔ اور شامی فوج کی ہائی کمان کے ترجمان ہفت روزہ "جیش الشعب" میں ابراہیم خلاص کے قلم سے شائع ہوتی تھی[2]۔

"عرب قوم نے خدا کو مدد کے لئے پکارا۔ اسلام اور مسیحیت کی بوسیدہ قدروں کی جستجو کی۔ سرمایہ داری، جاگیرداری اور قرون وسطیٰ کے بعض نظاموں کا سہارا لیا۔ لیکن ان میں سے کسی ایک نے اس کی ذرہ بھر مدد نہ کی۔"

"اسلام اور مسیحیت کی قدروں نے عرب انسان کو ذلیل اور توکل پرست بنا دیا۔ مجبور اور تابع بنا دیا۔ ایک ایسا انسان بنا دیا جو صرف یہ کہنا جانتا ہے کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔"

"البتہ جدید قدریں جو نیا "عرب انسان" تیار کر رہی ہیں، ترقی پسند اور مصیبت زدہ انسان کے سینے سے پھوٹی ہیں، بھوکے انسان کے دل سے اُبلی ہیں۔ جدید انقلاب پرست اشتراکی انسان کی ذات ان کا سرچشمہ ہے۔"

"عرب تہذیب کی تعمیر جدید اور عرب سماج کی تشکیل نو کا واحد راستہ یہ ہے کہ ایک جدت پسند، انقلاب پرست، اشتراکی انسان کو جنم دیا جائے جس کا پختہ ایمان ہو کہ خدا دین، سرمایہ داری، جاگیرداری، سامراج اور وہ تمام قدریں جو آج تک سماج پر چھائی رہی ہیں۔ محض خطوط شدہ لاشیں ہیں اور فقط تاریخ کے میوزیم کی زینت ہیں۔"

"ہم جب یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ جدید انسان کو پچھلی تمام قدریں ردّی کی ٹوکری میں اُٹھا کر پھینک دینی چاہئیں تو اس کے ساتھ ہی ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ ہم مخصوص نوعیت کی نئی قدریں وضع کریں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بنیادی طور پر صرف ایک ہی قدر درکار ہے اور وہ ہے "جدید خود مختار انسان" پر ایمان مطلق۔ جو صرف اپنی ذات اور اپنے کام اور انسانیت کی خدمت پر بھروسہ کرتا ہو اور اسے یقین ہو کہ موت

---

[1] یہ تمام اقتباسات ہم نے دمشق کے ہفت روزہ "الشہاب" شمارہ ۱۵، جنوری ۱۹۵۶ء سے نقل کیئے ہیں۔ بعث پارٹی کی ان تحریروں کے خلاف شامی پارلیمنٹ میں ہنگامہ بھی ہوا تھا۔

[2] ملاحظہ ہو روزنامہ "الحیاۃ" بیروت شمارہ ۵ مئی ۱۹۶۰ء۔ نیز ہفت روزہ "اخبار العالم الاسلامی" مکہ بابت ۵ جون ۱۹۶۷ء

اس کا حتمی خاتمہ ہے اور موت کے بعد کچھ نہیں ہے جنت اور دوزخ سب افسانے ہیں۔ انسان موت کے بعد ایک ذرّے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور گردش زمین کے ساتھ گردش کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنی قوم اور انسانیت پر کسی صلہ کی خواہش کے بغیر ہر وہ چیز قربان کرنے کے لئے بے قرار رہتا ہے جو اس کی ملکیت میں ہوتی ہے اس کے دل میں جنت کے کسی چھوٹے سے چھوٹے گوشے کے حصول کی بھی خواہش نہیں ہوتی۔ وہ صرف یہ خواہش رکھتا ہے کہ فنا ہو جانے کے بعد کہا جائے کہ وہ فی الواقع سچا مزدور تھا۔"

"ہمیں ایسے انسان کی ضرورت نہیں ہے جو نمازیں پڑھتا ہو اور ذلیل و عاجز بن کر رکوع میں جھکتا ہو۔ اپنے لئے رحم اور مغفرت کی طلب میں سرگرداں ہو، کیونکہ فرائسٹ کی زبان میں نماز کا خلاصہ یہ ہے کہ "اے میرے خدا مجھے سنبھال کر رکھ" ہم جس انسان کے ضرورت مند ہیں وہ اشتراکی اور انقلاب پسند انسان ہے جس کا ایمان ہو کہ انسان ہی حقیقتِ مطلقہ ہے۔"

"بوسیدہ اور ذلت پسند انسان کے خاتمہ پر جو بوسیدہ اور لچک سے عاری قدروں کا شرعی وارث ہے۔ ہم آنسو نہیں بہائینگے جس طرح مصری خاتون غادۃ السمان نے ٹائم میں "کیا خدا مر گیا؟" کا مضمون پڑھ کر آنسو بہائے تھے۔ اگر غادۃ السمان جولین ہکسلے کی کتاب "صرف انسان ہی قائم و دائم ہے" پڑھ لیتی تو نہ معلوم اس پر کیا گذرتی۔ اے غادۃ! تو اپنے پاگل انسان پر یا خود اپنی ذات پر جتنا چاہے نالۂ و شیون برپا کر، میرے خیال میں تو یہ کہہ رہی ہے کہ "اے مذہب کے علمبردارو مجھے بچاؤ۔" لیکن تیری یہ پکار گذر جانے والوں کی صدائے بازگشت کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

بعث پارٹی اور مارکسزم

اشتراکیت کے بارے میں بعث پارٹی کا تصور کوئی ڈھکا چھپا تصور نہیں ہے۔ بعث پارٹی جب اشتراکیت کا نام لیتی ہے تو اس سے مراد صاف صاف مارکسی اشتراکیت ہوتی ہے۔ جو طریقہ مارکسی اشتراکیت کو عملی جامہ پہنانے کے لئے روس اور چین میں اختیار کیا گیا ہے بعث پارٹی بھی اسی طریقے کی علمبردار ہے۔ اسی لئے وہ اپنی اشتراکیت کو "انقلابی اور علمی اشتراکیت" کی اصطلاح سے بیان کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل بیانات سے یہ بات خوب واضح ہو جاتی ہے۔

بعث کے رکن رکین صلاح الدین بیطار نے ایک پریس بیان میں کہا:-

"سب سے پہلے میں بعث کے شعار (اشتراکیت) سے پردۂ ابہام دور کرنا چاہتا ہوں ....." عرب اشتراکیت" کے لفظ سے یہ شبہ ہو جاتا ہے کہ ہم اشتراکیت کی کوئی نئی قسم ایجاد کر رہے ہیں۔ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہماری نگاہ میں اشتراکیت کی ایک ہی قسم ہے اور وہ ہے "سائنٹفک سوشلزم" ....چنانچہ مارکسزم ہمارے نزدیک اشتراکی نظریہ کا اساسی ماخذ ہے۔"[۵۱]

فروری ۶۶ء کو جب بعث پارٹی کے بائیں بازو نے انقلاب برپا کیا تو اس کی حمایت میں ڈاکٹر نورالدین اتاسی (موجودہ صدر شام) نے ۵ مارچ کو ایک بیان میں واضح کیا کہ "ہمارا مشن سائنٹفک سوشلزم یعنی مارکسزم کا نفاذ ہے۔"[۵۲]

---

۵۱ ملاحظہ ہو روزنامہ الاحد، بیروت، شمارہ ۲۱ اپریل ۱۹۶۳ء بیان صلاح بیطار، وزیر اعظم شام۔

۵۲ ملاحظہ ہو مجلہ الطلیعہ، قاہرہ شمارہ جولائی ۱۹۶۶ء۔

مائیکل عفلق نے اشتراکیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:-

"ہم مارکسزم کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اشتراکی ہونے کی حیثیت سے ہم مارکسزم سے بہت کچھ مواد اخذ کریں گے۔"[۵۱]

اسی بناء پر بعث پارٹی طبقاتی جنگ برپا کرنے کی حامی ہے اور قتل و غارت اور سلب و نہب کو مارکسزم کے عروج کے لئے ضروری سمجھتی ہے:-

"عوام کے پسماندہ طبقے کے ذہن میں طبقاتی تعاون کا جو بچا کھچا تصور موجود ہے اس کی تطہیر اور اخراج نہایت ضروری ہے۔ اس جنگ کا تقاضا صرف اتنا ہی نہیں کہ قلع قمع کرنے پر اکتفا کیا جائے بلکہ غلط نظریات کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے۔ انقلابی عوام کو بورژوا طبقے کے خلاف طبقاتی جنگ کا مسئلہ واضح اور قطعی شکل میں اختیار کرنا چاہیئے۔ یا ہم زندہ رہیں گے اور یا بورژوا زندہ رہیں گے۔ کوئی بھی درمیانی حل محض جھوٹ اور فریب ہوگا اور اس کا مقصد بورژوائیت کا بچاؤ ہوگا۔"

"بعث پارٹی شہریوں کو "سائنٹفک سوشلزم" یعنی مارکسزم کی تربیت دینا چاہتی ہے تاکہ انھیں ان بوسیدہ اجتماعی افکار اور روایات سے نجات دلائی جائے جنھیں وہ نسلاً بعد نسل سینے سے لگائے چلے آرہے ہیں اور تاکہ ایک ایسا عرب انسان تیار کیا جاسکے جو روشن اور سائنٹفک شعور سے بہرہ ور ہو، جدید اشتراکی اخلاق سے آراستہ ہو۔ اجتماعی اقدار پر ایمان رکھتا ہو۔"[۵۲]

بعثی اشتراکیت کے نتائج

بعث پارٹی کی اشتراکیت کی وجہ سے شام کی اندرونی طور پر جو حالت ہو چکی ہے اُسے ہم ایک عرب مصنف کی زبان سے بیان کرتے ہیں:-

"اقتصادی طور پر شام کی جو بدحالی ہو چکی ہے وہ الگ ایک موضوع ہے۔ آبادی کے لحاظ سے بھی شام کی حالت اس مریض کی طرح ہو چکی ہے جس کے جسم سے خون کی غیر معمولی مقدار بہہ چکی ہو شام کے انجینیر، پروفیسر، ماہرین اُمور مملکت، خصوصی مہارت رکھنے والے افراد جن پر شام نے کئی ملین صرف کیئے۔ ڈاکٹر، سائنس داں، ادباء، اخبارات اور ٹیلی ویژن اور ریڈیو میں کام کرنے والے، صنعت کار اور صنعت پیشہ، بڑے درمیانے اور چھوٹے تاجر، روپیہ لگانے والے، قانون داں، اربابِ صحافت، صنعت کار اور تاجر، بلکہ چھوٹے چھوٹے ملازمین اور کاشتکار اور مزدور تک بہت بڑی تعداد میں ملک چھوڑ چکے ہیں۔ صرف سینی گال کے اندر ایکہزار ۵ سو شامی ماہرین جا چکے ہیں۔ مراکش، تونس، لیبیا، سوڈان اور یورپ کے مختلف شہروں میں بھی شام کے مختلف طبقوں کے مہاجر بہت بڑی تعداد میں نظر آرہے ہیں حالانکہ وہاں کاروبار کے لئے کٹھن شرائط پائی جاتی ہیں۔ کویت اور قطر اور سعودی عرب میں جو شامی ہجرت کر گئے ہیں انمیں سابق وزراء، ریٹائرڈ فوجی افسر، پروفیسر، ڈاکٹر اور دوسرے محنت کار ہیں۔ شام کا اکثر و بیشتر سرمایہ لبنان منتقل ہو چکا ہے۔ کل تک شام کو جو صنعتی رونق حاصل تھی وہ آج لبنان کو حاصل ہو چکی ہے شام دوسرے عرب ممالک سے کٹ چکا ہے۔ اشتراکی دور سے پہلے شام کی مصنوعات اور

---

۵۱ اخبار الجماہیر، بغداد، شمارہ ۲۰ فروری ۱۹۶۳ء۔

۵۲ ملاحظہ ہو کتابچہ "ایدیولوجیہ حزب البعث" شائع شدہ ۱۹۶۴ء۔

پیداوار دنیا کی منڈیوں میں فراوانی سے پہونچتی تھیں۔ شام اپنا زائد غلہ اور روئی برآمد کرتا تھا ایک مرتبہ صرف دمشق نے فلوریڈا اور نیویارک کو ۳۰ لاکھ شامی لیروں کا کاٹج برآمد کیا تھا۔ اس وقت لبنان میں ۲ لاکھ ۸۰ ہزار شامی ٹیکنیکل ہینڈز موجود ہیں۔ شام کو اب اگر جاکر دیکھا جائے تو وہ ویران اور ریگستان صحرا کا نمونہ پیش کرتا ہے معمولی چھوکرے اس پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ بازار اچھے تاجروں سے خالی ہو چکے ہیں۔ کساد بازاری کا دور دورہ ہے۔ باہمی اعتماد رخصت ہو چکا ہے۔ دیہات کی حالت اور بھی دگرگوں ہے۔ موجودہ دور میں ان دیہات کے لوگ جس مفلوک الحالی سے دوچار ہیں وہ پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ اگرچہ اشتراکی دور کے ہر شخص کی پیشانی پر بدقسمتی چسپاں ہو چکی ہے مگر کسان اور مزدور کی حالت سراسر ناگفتہ بہ ہے۔ حالانکہ کسان اور مزدور کے نام پر ہی تمام اشتراکی انقلاب برپا ہو رہے ہیں[۱]۔"

اقتصادی لحاظ سے شام دیوالیہ ہو چکا ہے شام کا تمام سرمایہ باہر منتقل ہو چکا ہے۔ کارخانے اور فیکٹریاں بند پڑی ہیں۔ خود شام کے وزیر اقتصاد شہریوں کی شکایات کا جواب دیتے ہوئے اقتصادی بحران کے وجوہ یہ بیان کرتے ہیں:۔

الف۔ ملکی منڈیوں پر جمود طاری ہے اور ہمسایہ ممالک کو ہماری برآمد نہ ہونے کے برابر ہے۔

ب۔ بعض بینکوں اور تجارتی اداروں کے ساتھ معاملات میں گڑبڑ ہو گئی ہے کیونکہ ۶ ماہ سے درآمدات کی قیمتیں ان کو ادا نہیں کی گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فارن سیکٹر میں ملکی آمدنی سکڑ گئی ہے۔

ج۔ اشیاء بازار سے غائب ہو گئی ہیں بعض کمیاب ہیں۔ اشیاء کی قیمتیں بالعموم بڑھ گئی ہیں۔

د۔ جدید تجارتی، زراعتی اور صنعتی منصوبے نافذ نہیں کئے جا سکے[۲]

مشہور شامی سوشلسٹ لیڈر اکرم حورانی کا بیان ہے کہ "رجعت پسندوں کے دور میں تقسیم اراضی کے اندر عدل اجتماعی کی جامع اور ہمہ گیر مثالیں ملتی ہیں۔ انقلابی دور میں وسائل کی فراوانی کے باوجود یہ مثال مفقود ہیں[۳]۔"

تشدد کا راستہ

حکمراں گروہ نے تمام زمینداریوں کو قومی ملکیت بنا لیا۔ ان کے مالکوں کو ایک پائی معاوضہ نہیں دیا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نصیری اور دروزی زمیندار "اشتراکی قوانین" سے محفوظ رہے۔ یہ قوانین صرف مسلمان "رجعت پسندوں" کے لئے مخصوص ہیں — آج بڑے بڑے رجعت پسند جنھوں نے شام کو فرانس کی غلامی سے نکالا تھا۔ مثلاً شکری القوتلی[۴]، معروف دوالیبی، یہ سب ملک بدر ہیں "اشتراکی قوانین" کو جس تشدد اور جبر کے ساتھ نافذ کیا جا رہا ہے اس کا اندازہ صرف ایک مثال سے ہو سکتا ہے۔ جنوری ۱۹۶۷ء کے پہلے ہفتے میں شام کے شمالی علاقے میں الشجرہ نامی ایک قصبے کے اندر فوجی عدالت قائم کی گئی۔ اس فوجی عدالت کا مقصد ان کسانوں اور غریب فلاحین کا محاسبہ تھا جنھوں نے اشتراکی احکام کی تعمیل سے انکار کر دیا تھا یا ان کی تنفیذ میں کسی نہ کسی حیثیت سے رکاوٹ پیدا کی تھی۔ چنانچہ ان کسانوں کو عدالت کی طرف سے عبرتناک سزائیں

---

[۱] ملاحظہ ہو کتاب "یوم ان لا یتشابھان" تالیف احمد فؤاد الیمانی مطبوعہ دار الریحانی۔ بیروت ص ۱۲۸ تا ۱۳۱ [۲] سقوط الثورات الاشتراکیۃ ص ۱۳۶
[۳] الاشتراکیۃ فی التجارب العربیۃ، مکتبہ دار الکتاب الجدید لبنان۔ ص ۸۵ [۴] ۲۹ جون ۶۷ء کو شکری القوتلی بیروت کے ایک اسپتال میں ۴

۴ انتقال کر گئے ہیں۔ مرحوم شام کے صدر رہ چکے ہیں

دی گئیں[1]۔

شامی عوام کے ساتھ بعث نے جو سلوک کیا اس کا کسی قدر اندازہ قارئین کو ہوگیا ہوگا مگر خود بعث پارٹی کے اندر طوائف الملوکی کا جو دور دورہ ہوا ہے اور شامی فوج کی جس طرح دھجیاں اُڑی ہیں وہ اس داستان کا نہایت ہی دردناک حصہ ہے۔ بعث پارٹی نے اختیارات ہاتھ میں لینے کے بعد شام کے اسٹیج پر جو سیاسی ڈرامے کھیلے ہیں اُن کا مختصراً بیان یہ ہے:۔

غیر بعثی عناصر کی تطہیر

انقلاب برپا کرنے کے بعد بعثی عناصر نے "تطہیر" کا عصا ہاتھ میں لیا اور سول اور فوج کے اہم مناصب سے ان تمام عناصر کو نکالنا شروع کر دیا جو بعث کے نظریہ کے خلاف تھے یا بعث پارٹی کے لیڈروں سے ان کے ذاتی اختلافات تھے۔ اس تطہیر کی مہم میں انھوں نے ناصر کے حامی عناصر کو برطرف کیا۔ اسلام پسند عناصر کو چن چن کر ختم کیا بلکہ زیاد الحریری جو مارچ ۱۹۶۳ء کے بعثی انقلاب کا ہیرو تھا اُسے بھی بیک بینی دو گوش ملک سے نکال باہر کیا گیا کیونکہ وہ بعث کے نظریہ کا حامی نہیں تھا اور شبہ تھا کہ کہیں قاہرہ کی طرف رجحان نہ رکھتا ہو۔ ہنگامۂ دار و گیر نے ملک کے اندر شدید اضطراب کی صورت اختیار کر لی۔ مخالفین سے انتقام در انتقام کا ایک ہولناک سلسلہ شروع ہوگیا۔ نہ کوئی قانون کی حرمت باقی رہی اور نہ کسی فرد کی عصمت و آبرو کا تحفظ رہا۔ جنرل امین الحافظ اور صلاح الدین بیطار نے یکسوئی کے ساتھ اُمورِ خسروانی انجام دینے شروع کر دیئے۔ اول الذکر صدر اور ثانی الذکر وزیر اعظم بنے۔ تمام نمایاں فوجی افسروں کو "مالِ غنیمت" میں سے حصہ دیا گیا۔ کچھ لوگوں کو سفیر بنا کر باہر بھیج دیا گیا۔ کچھ لوگوں کو ملک کے اندر ہی "زرخیز" مناصب دیئے گئے۔ تقسیم دولت کے دوران ہی خود بعث پارٹی کے اختلافات بلکہ کشمکش کا آغاز ہوگیا جنرل محمد عمران جس نے بعثی انقلاب میں حماہ کو فتح کیا تھا۔ اور امین الحافظ کے درمیان کھچاؤ پیدا ہوگیا۔ نتیجۃً جنرل محمد عمران کو میڈرڈ میں سفیر بنا کر بھیج دیا گیا۔ مگر صلاح الدین بیطار نے تھوڑے عرصہ بعد واپس بلا کر وزیر دفاع بنا دیا۔

بعث قیادت میں پھوٹ

دسمبر ۱۹۶۵ء میں بعث پارٹی دو حصوں میں بٹ گئی۔ ایک بعث کی "بین الاقوامی کمان" اور دوسری "علاقائی کمان"۔ بین الاقوامی کمان کی قیادت مائیکل عفلق، امین الحافظ اور صلاح الدین بیطار کے ہاتھ میں تھی اور "علاقائی کمان" پر لفٹیننٹ اور دروزی فوجی افسروں کا قبضہ تھا۔ علاقائی کمان نے یہ دیکھ کر کہ شام کی حکمرانی کا سارا لطف بین الاقوامی کمان اٹھا رہی ہے۔ اپنے مطالبات پیش کئے۔ مگر مائیکل عفلق نے ایک طویل فلسفیانہ یادداشت کے ذریعے ان مطالبات کو ٹھکرا دیا اور علاقائی کمان کو توڑ دیا۔ آخر علاقائی کمان نے "بین الاقوامی کمان" کے خلاف بغاوت کر دی۔ جنرل صلاح جدید اور بریگیڈیر سلیم حاطوم اور ان کے دوسرے ساتھیوں نے مل کر دمشق پر لشکر کشی کر دی اور اس تاریخی شہر پر توپوں سے خوب گولہ باری کی[2]۔ بین الاقوامی کمان کا دفتر، جو قصرِ صدارت میں تھا ان گولوں کا نشانہ خاص تھا۔ امین الحافظ کے بیوی بچے اس گولہ باری میں مارے گئے۔ خود امین الحافظ بھی شدید زخمی ہوا اور اُسے المزہ جیل کے اسپتال میں داخل کیا گیا۔ بعث پارٹی کے بانی مائیکل عفلق کی گردن بھی ناپی گئی اور اُسے بھی المزہ جیل بھیج دیا گیا[3]۔

---

[1] سقوط الثورات الاشتراکیۃ [2] بیروت کے ہفتہ وار الجمہور الجدید نے لکھا ہے کہ "فرانس نے دمشق پر صرف ایک مرتبہ حملہ کیا تھا مگر عود اہلِ شام دمشق پر ۲۵ مرتبہ حملہ کر چکے ہیں۔ [3] مائیکل عفلق کو بعد میں شام سے نکال دیا گیا۔ البتہ امین الحافظ المزہ جیل میں قید رہا اور اب حالیہ جنگ کے دوران اُسے رہا کر کے شام سے بیروت بھیج دیا گیا ہے۔

فوج اور سول کے وہ تمام افسر جن کا نام "بین الاقوامی کمان" کی فہرست میں شامل تھا اسی انجام سے دوچار ہوئے خاص طور پر فوج کے مسلمان افسروں کی تطہیر کی گئی۔ حالانکہ یہ مسلمان دینداری کے لحاظ سے صفر تھے۔ مگر اقلیتی فرقوں کی مذہبی عصبیت نام کے مسلمانوں کو بھی گوارا کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔

علویوں اور دروزیوں میں پھوٹ

۸ ستمبر ۱۹۶۶ء کو مذہبی تعصب نے ایک اور رُخ اختیار کر لیا۔ جنرل صلاح جدید (نصیری) اور سلیم حاطوم (دروزی) کے درمیان ٹھن گئی۔ سلیم حاطوم کو شکایت تھی کہ ہر جگہ نصیریوں کا غلبہ ہے جب کہ نصیری ہر سیکٹر میں صرف دو تہائی اسامیوں کے مستحق ہیں۔ نصیریوں اور دروزیوں کی یہ کشمکش ٹھنڈی جنگ سے گرم جنگ کی شکل اختیار کر گئی۔ چنانچہ ۸ ستمبر ۱۹۶۶ء کو سلیم حاطوم، طلال ابو علی اور ان کے پندرہ ساتھی فوجی افسروں نے انقلاب کی ایک اسکیم تیار کی۔ اس اسکیم کے تحت مؤخر الذکر گروہ صلاح جدید اور چند دوسرے جنرلوں کو مصالحتی گفت و شنید کے بہانے اپنے مرکز میں بلا کر گولی سے اُڑانے کے بعد اقتدار پر قبضہ کر لینے کا اعلان کرنے والا تھا۔ قاہرہ کو اس کا علم تھا۔ مگر قاہرہ نے دوغلا کردار ادا کیا۔ ایک طرف سلیم حاطوم کے گروہ کی حوصلہ افزائی کی اور وقت آنے پر مدد کا یقین دلایا۔ اور دوسری طرف صلاح جدید اور اس کی حکومت کو اس سازش سے باخبر کر دیا۔ چنانچہ یہ سازش بے نقاب ہو گئی اور سلیم حاطوم اور پندرہ بڑے بڑے فوجی افسر جن میں تمام دروزی تھے، بھاگ کر اُردن چلے گئے اور وہاں سیاسی پناہ حاصل کر لی۔ انھوں نے عمان میں ایک پریس کانفرنس میں اپنے بیانات میں بتایا کہ:-

الف:- شامی حکام میں فرقہ بندی اور گروہی تعصب پایا جاتا ہے اور اس وقت فوج میں علویوں (نصیریوں) کو غلبہ حاصل ہے۔

ب:- شامی حکام نے کمیونسٹوں کے ساتھ ساز باز کر لی ہے اور اس وقت کمیونسٹ ہی تمام سول محکموں پر چھائے ہوئے ہیں۔

علوی اقلیت اور روس

اسلام پسندوں، ناصریوں اور دروزیوں کی تطہیر کے بعد میدان میں اب صرف نصیری رہ گئے ہیں اور شام اس وقت کلیتہً اسی فرقے کے قبضے میں ہے۔ ۴۵ لاکھ کی آبادی میں اس فرقے کی تعداد سوا دو لاکھ سے زیادہ نہیں ہے۔ ایسی کمزور اقلیت کے لئے جس نے پورے ملک کو اپنا دشمن بنا لیا ہو، تنہا اپنے بل بوتے پر حکمرانی کرنا بالکل محال ہے۔ اسی وجہ سے اس ناتواں اقلیتی حکومت نے بلا قید و شرط اپنے آپ کو روس کی گود میں ڈال دیا، اور روس نے نور الدین اتاسی (صدر شام اور ڈاکٹر یوسف زُعیّن، وزیر شام) کے کندھوں پر بندوق رکھ کر شام اور مشرق اوسط میں شکار کھیلنا شروع کر دیا۔ بعث پارٹی کا لباس بھی تبدیل کر دیا گیا اور اُسے "عوامی محاذ" کا نام دیا گیا۔ اس محاذ میں بعثی اور کمیونسٹ دونوں شامل ہیں۔ بلکہ بعثی تابع اور کمیونسٹ متبوع ہیں۔ اقتصادی اور سیاسی پالیسی مکمل طور پر ماسکو کے ہاتھ میں ہے۔ اقتصادی سیکٹر کے تمام کارکن جسے نیشنلائز کیا جا چکا ہے کمیونسٹ ہیں۔ "مسلح مزدوروں" کی تنظیم کا سربراہ خالد الجندی انتہا پسند کمیونسٹ ہے اور اس تنظیم کے تمام کارکن کمیونسٹ پارٹی کے ورکر ہیں۔ "فرات ڈیم" کے لئے روس نے امداد کا وعدہ کیا ہے۔ روس کے علاوہ مشرقی یورپ کے دیگر کمیونسٹ ممالک بھی شام کے مختلف منصوبوں کے لئے امداد کا وعدہ کر چکے ہیں۔ شام اور مصر کی مصالحت بھی اسی تبدیلی کی بدولت ہوئی ہے ورنہ دونوں ملکوں کا اتحاد ختم ہونے کے بعد سے یہ دونوں کئی ماہ تک ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشیوں میں مصروف تھے۔

"مسلح مزدور" نومبر ۱۹۶۶ء میں "انقلابی مزدوروں" کے

نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی۔ اس کا مقصد بتایا گیا۔ "شامی قوم کو رجعیت اور استعمار کے اثرات سے پاک کرنا"۔ اس کے بعد شام کے ۴ باشندوں کو غیر مسلح کر دیا گیا۔ پرائیویٹ اسلحہ رکھنا خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور ان "انقلابی مزدوروں" کو نہ صرف یہ کہ اسلحہ سے لیس کر دیا گیا بلکہ باقاعدہ انھیں فوجی تربیت بھی دی گئی اور ان کو کھلی چھٹی دے دی گئی کہ جس جگہ قدامت پرستی کی آواز اٹھے اسے وہیں دبا دیں۔ جن لوگوں نے حکومت کے خلاف آواز اٹھائی انھیں استعمار کا ایجنٹ قرار دیا گیا۔ ان کے گھروں کی تلاشیاں لی گئیں اور بے محابا انھیں زدوکوب کیا گیا۔ ان "انقلابی مزدوروں" نے مسجدوں کے اندر گھس کر دوران خطبہ اماموں اور خطیبوں کی بے عزتی کی اور انھیں حکومت پر تنقید کرنے سے روکا۔ شام میں یہ تنظیم اسی خطوط پر قائم کی گئی ہے جن خطوط پر چین ریڈ گارڈز (سرخ محافظوں) کی تنظیم قائم ہوئی ہے۔ سرخ محافظوں نے چین میں جو ثقافتی انقلاب برپا کیا ہے شام کے مسلح مزدوروں نے بھی رجعت پسندی کے استیصال کے لئے اُن کی تقلید کی ہے۔

اسرائیل کے حملے سے چند روز پہلے کے حالات

مئی ۱۹۶۷ء میں بعث حکومت کے ایک سرکاری ہفت روزہ جیش الشعب نے جب اسلام پر کھلم کھلا حملے شروع کئے تو مسلمان عوام نے علماء کی قیادت میں ان کے خلاف سخت احتجاج کیا، مظاہرے کئے اور ہڑتالیں کیں مگر عوام کو پُرامن طریقوں سے مطمئن کرنے کے بجائے انھیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ "مسلح مزدوروں" نے دوکانوں کے تالے توڑے اور ساز و سامان کو لوٹا۔ احتجاج کرنے والوں کو جیلوں میں ٹھونسا گیا۔ تقریباً ایک ہفتہ تک یہ صورت حال پورے ملک پر طاری رہی اور ابھی مظاہرے اور ہڑتالیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ جون ۶۷ء میں اسرائیل نے حملہ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اسرائیل کے لئے شام پر حملہ آور ہونے کے لئے اس سے زیادہ موزوں کوئی وقت نہ ہو سکتا تھا پھر جب جنگ شروع ہوئی تو بعث پارٹی اس پوزیشن میں نہ تھی کہ اپنی فوج دشمن کے مقابلے پر لا سکتی۔ اس نے ریزرو فوج اسرائیل سے لڑنے کے لئے بھیجی اور مستقل فوج ملک میں خود اپنے آپ کو اندرونی انقلاب سے بچانے کے لئے روک رکھی۔

ان تفصیلات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ جس فوج کا یہ حال ہو کہ اُس نے مسلسل ۱۸ سال تک خانہ جنگی میں گذارے ہوں اور اپنے بہترین آدمیوں کو خود ہی ختم کر دیا ہو جس کے قائدین ناسزا اور جس کے لشکری شکستہ ہوں، جس نے اپنی ساری طاقتیں خود اپنے ہی ملک کے باشندوں کو دبانے اور کچلنے پر صرف کر دی ہوں اور جس کے ہاتھوں ملک کا بچہ بچہ نالاں ہو۔ کیا وہ فوج اسرائیل کا مقابلہ کر سکتی تھی؟ اور کیا وہ عوام جن کے مذہبی عقائد کے خلاف جنگ کی جا رہی ہو، جن کو پوری طرح نہتا کر دیا گیا ہو اور جن کی اقتصادی اور اخلاقی قوت کو باہر سے درآمد کئے ہوئے نظریات و افکار کی ترویج و تنفیذ سے اَدھ موا کیا جا چکا ہو۔ کیا وہ مصیبت پڑنے پر اپنی فوج کی حمایت پر کھڑے ہو سکتے تھے؟ اور کیا وہ پارٹی جو کھلم کھلا خدا اور رسولؐ کی دشمن ہو وہ ایک مسلمان ملک کے عوام میں روح جہاد اور جذبۂ فداکاری پھونک سکتی تھی؟

اس کے علاوہ یہ تفصیلات ایک اور حقیقت بھی جو اس سے تلخ تر ہے ہمارے سامنے بے نقاب کرتی ہیں۔ دنیائے مسلمان اس غلط فہمی میں ہیں کہ عالم اسلامی کے قلب میں صرف ایک ہی خنجر اسرائیل ہے جو امریکہ اور برطانیہ نے پھونکا ہے۔ لیکن یہ حالات بتا رہے ہیں کہ بعث پارٹی ایک دوسرا خنجر ہے جو اسلامی دنیا کے قلب میں روس نے پھونک رکھا ہے۔ (ترجمان القرآن)

خریدار حضرات اپنا خریداری نمبر اپنے خطوط میں ضرور لکھیں۔ (منیجر تجلی)

مولانا مودودی کی مجلس

لائل پور میں کارکنوں سے خطاب کے موقع پر سوال و جواب کی ایک نشست

اسلامی سوشلزم

س۔ آج کل اسلامی نظام کے بجائے "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح بہت بولی جا رہی ہے۔ اس کا مفہوم کیا ہے؟

ج۔ جن لوگوں نے "اسلامی سوشلزم" کی اصطلاح وضع کی ہے۔ وہی اس کی وضاحت کر سکتے ہیں۔ اخبارات میں لوگ مختلف قسم کی تشریحیں کر رہے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کو بھی مستند قرار نہیں دیا جا سکتا ـــــ سوشلزم (SOCIALISM) کا لفظ انگریزی زبان میں (INDIVIDUALISM) کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے یعنی انفرادیت کے مقابلے میں اجتماعیت۔ اسلام جتنا اجتماعیت پسند (SOCIALIST) ہے اتنا ہی وہ انفرادیت پسند (INDIVIDUALIST) بھی ہے اب اگر کوئی شخص اسلام میں انفرادیت کی اہمیت کو نظر انداز کر کے اس کی اجتماعیت کو ہی معاشرے اور حکومت میں نافذ و رائج کرنا چاہتا ہے۔ تو یہ کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ اسلام میں فرد اور جماعت دونوں کے حقوق کی نگہداشت کا اہتمام موجود ہے وہ انفرادی اصلاح کا پروگرام بھی رکھتا ہے اور اجتماعی اصلاح کا بھی۔ جس طرح ایک آدمی کا دھڑ کاٹ دیا جائے تو وہ آدمی ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اسلام بھی قابلِ تجزیہ نہیں ہے کہ اس کے من پسند اجزاء تو لے لئے جائیں اور باقی چھوڑ دیئے جائیں۔

سوشلزم جس حیثیت سے دنیا میں معروف ہے۔ وہ ایک خاص مسلک ہے۔ اس مسلک کے مذاہب (SCHOOLS OF THOUGHT) اگرچہ مختلف ہیں۔ لیکن ایک چیز قدر مشترک ـــــ کے طور پر سب میں نمایاں ہے۔ وہ یہ کہ ملک کے تمام ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لے لیا جاتا ہے۔ اور حکومت انھیں اپنی صوابدید کے مطابق استعمال کرتی ہے۔[1]

اس کے برعکس اسلام نیشنلائزیشن کو بطور پالیسی کے کبھی اختیار نہیں کرتا۔ اور اسلام میں اس بات کی گنجائش ہے۔ کیونکہ اسلام فرد سے وہ خیر چاہتا ہے جو اپنے دلی ارادے سے انجام دے مثلاً دولت مند افراد معاشرے کے غریبوں اور حاجتمندوں پر اپنی دولت ارادے اور رضا سے خرچ کریں۔ لیکن اگر ایک ایسا نظام بنا دیا جائے جس میں سارا کام ایک مشین کی طرح

[1] عام افراد کی املاک اور ملک کے ذرائع پیداوار وغیرہ کو قومیا لینا۔

چل رہا ہو، تو اس میں اس فضا کا پیدا ہونا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ اسلام جس راہ پر فرد کو چلانا چاہتا ہے ـــ وہ اس نظام میں ختم ہو کر رہ جائے گی۔

جو لوگ جمہوریت اور سوشلزم دونوں کا نام لیتے ہیں مجھے ان پر سخت حیرت ہے سوشلزم جہاں بھی آیا ہے۔ آمریت کے ذریعہ سے آیا ہے۔ یا اگر جمہوریت کے ذریعہ سے قائم ہوا ہے، تو گویا جمہوریت نے خودکشی کی ہے۔ ذرا سوچئے جہاں ذرائع پیداوار قومی ملکیت میں نہیں ہیں۔ وہاں آمریت کس دھڑلے سے چل رہی ہے۔ اگر بالفرض سوشلزم آجائے اور تمام ذرائع پیداوار حکومت کی تحویل میں چلے جائیں۔ تو پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ لکھنے بولنے، اور مجتمع ہونے کی آزادی تو ایک طرف رہی۔ علم و ارادے اور ضمیر کی آزادی بھی برقرار نہیں رہے گی۔

جو سیاسی پارٹیاں اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگا رہی ہیں، انھیں چاہیئے کہ وہ اپنے مفہوم و مدعا کی پوری طرح وضاحت کریں۔

ملک کے علماء کا تعاون؟

س۔ تحریک اسلامی کے لئے ملک کے علماء کا تعاون کو شاید آپ معمولی بات سمجھتے ہیں کہ اس کی طرف توجہ نہیں دیتے؟

ج۔ میں اسے معمولی بات نہیں سمجھتا۔ لیکن وہ لوگ میری عزت کو بھی معمولی بات سمجھتے ہیں۔ مجھے رات دن گالیاں دی جاتی ہیں۔ میرے خلاف پمفلٹ جاری کئے جاتے ہیں اشتہارات تقسیم کئے جاتے ہیں لیکن ان سب کے باوجود میں کچھ جواب نہیں دیتا۔ چاہیئے تو یہ کہ آپ ان علماء سے اس عناد کا سبب پوچھیں، الٹے مجھ سے استفسار کر رہے ہیں مثل مشہور ہے کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے لیکن یہاں معاملہ یہ ہے کہ ایک ہاتھ تو اپنی جگہ ساکت ہے اور دوسرا ہاتھ آ آ کر اس پر لگ رہا ہے۔ اب اگر پہلے ہاتھ کو بھی حرکت دی جائے۔ خواہ وہ صلح کی غرض سے کیوں نہ ہو۔ تو دوسرا ہاتھ جب اس پر آ کر لگے گا تو اس کا نتیجہ تالی کے سوا کیا نکل سکتا ہے۔

فوٹوگرافی اور سینما

س۔ سنا تھا کہ آپ فوٹوگرافی کو اچھا نہیں سمجھتے لیکن معلوم ہوا ہے کہ آپ نے تصویریں اتروائی ہیں؟

ج۔ "اتروائی ہیں" ـــ درست نہیں۔ ہاں یہ درست ہے کہ اتاری گئی ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ تصویر اتاری نہیں بلکہ اتروائی جاتی تھی اور اس کے لئے باقاعدہ پوز بنا کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ لیکن اب یہ فن اتنا ترقی کر گیا ہے کہ انسان کی ہر حرکت اس میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ جس طرح گولی بغیر بتائے ہوئے چلا دی جاتی ہے۔ اسی طرح کیمرہ بھی اپنا عمل کرتا ہے۔

س۔ کیا میں فوٹوگرافی کو اپنا مشغلہ بنالوں؟

ج۔ فوٹوگرافی کا فن بجائے خود ممنوع نہیں۔ ذی حیات کا فوٹو کھینچنا منع ہے اس سے اجتناب کرتے ہوئے اگر آپ مظاہر قدرت کے فوٹو کھینچیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن آپ اسے بطور مشغلہ اپنائیں گے تو جانداروں کی تصویروں سے مجتنب رہنا آپ کے لئے ممکن ہوگا۔

س۔ ذی حیات کی فوٹوگرافی حرام ہے تو سینما اور ٹیلیویژن کے بارے میں کیا حکم ہے۔

ج۔ میرے نزدیک فوٹو کا اطلاق اس وقت ہوگا جب اسے چھاپ کر ثابت و قائم کر دیا جائے۔ سینما اور ٹیلی ویژن میں تصاویر کی حیثیت پرچھائیں کی ہے۔ اس لئے اس کا استعمال ناجائز نہیں۔

سینما اور ٹیلی ویژن کو اخلاقی اور دوسرے تعمیری مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے تو عوام کی معلومات کا معیار انڈر گریجویٹ تک بڑھایا جا سکتا ہے لیکن افسوس انھیں اخلاقی بگاڑ کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔

عدالتیں اور عدالتی نظام

س۔ آپ کئی بار جیل جا چکے ہیں اور ہر بار آپ کے مخالفین ہی کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔ پھر آپ ان کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ کیوں نہیں کرتے؟

ج۔ ہمارے ملک میں عدالتیں ابھی اس حد تک آزاد ہیں، کہ حکومت کے خلاف فیصلہ دے سکتی ہیں۔ اُن پر اس سے زیادہ بار نہ ڈالئے کہ ان کی یہ آزادی و اختیار بھی سلب ہو جائے۔ یہی کیا کم ہے کہ عدالتوں سے فیصلے آنے کے بعد ہماری اخلاقی پوزیشن مضبوط ہوتی ہے اور ہمارے مخالفین کی اخلاقی پوزیشن ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی ایسی حکومت جس کی اخلاقی پوزیشن ختم ہو جائے۔ کبھی تادیر قائم نہیں رہ سکتی۔

س۔ موجودہ عدالتی نظام غیر اسلامی ہے، تو پھر ایک مسلمان دادرسی کے لئے کس طرح رجوع کرے۔

ج۔ جب دستور میں اس بات کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے اور ملک کا قانون قرآن و سنت کے مطابق بنایا جائے گا۔ تو اصولاً یہ عدالتی نظام اسلامی ہو چکا ہے ـــــ اب اگر اس دستوری صراحت کے باوجود ملک کے قوانین اور عدالتی نظام کو نہیں بدلا جا رہا ہے تو یہ فسق ہے، کفر نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح، جیسے ایک شخص کلمہ طیبہ کا اقرار کر کے مسلمان ہونے کا اقرار تو کرتا ہے لیکن اپنے عمل سے اس کا ثبوت فراہم نہیں کرتا ـــــ وہ اگرچہ فاسق ہے۔ لیکن دائرۂ اسلام سے خارج نہیں۔

اسلام کا نام لینے والے حکمران

س۔ ہمارے حکمران صرف اس لئے اسلام کا نام لیتے ہیں کہ اس کے بغیر حکمرانی ممکن نہیں۔ ان کے اس طرز عمل کے بارے میں کیا حکم ہے۔

ج۔ اس حقیقت کو سمجھ لیجئے کہ کفر و اسلام کے درمیان ایک صورت نفاق کی بھی ہے۔ جس طرح ایک منافق زبان سے تو اسلام کا اقرار کرتا ہے۔ لیکن دل میں اس کے خلاف بغض اور کینہ رکھتا ہے ـــــ بالکل یہی صورت ہمارے سامنے بھی ہے۔

اسلامی دستور تو قوم کے مطالبے سے تسلیم ہوا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ مملکت اسلامی ہو چکی ہے۔ اب جو کچھ کیا جا رہا ہے۔ ایک متولی کی زیادتی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ـــــ جیسے آپ لڑ جھگڑ کر ایک مسجد تو تعمیر کرائیں۔ لیکن کوئی شخص اس پر ناجائز قابض ہو کر عیش و طرب کی محفلیں سجانے لگے۔ اس کے اس فعل سے مسجد کی حیثیت تو ختم نہیں ہوتی۔ آج آپ اسے بے دخل کر دیں۔ تو وہ مسجد جوں کی توں قائم ہے۔

کیا مظلوم ظالم سے ٹکر لے سکتا ہے

س۔ کیا مظلوم اپنے حق کے حصول کے لئے ظالم سے ٹکر لے سکتا ہے؟

ج۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مظلوم اپنے حق کے لئے ظالم کے خلاف چارہ جوئی کر سکتا ہے ـــــ لیکن اس سوال کا جواب بڑا وسیع المعانی ہے ـــــ مظلوم ظالم کے خلاف کن حالات میں کیا رویہ اختیار کرے اور امن و قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے وہ کیا طرز عمل اپنائے ـــــ اس صورت کو زبانی واضح نہیں کیا جا سکتا۔

انڈونیشیا کے سابق صدر سوکارنو کا معاملہ

س۔ انڈونیشیا کے سابق صدر سوکارنو نے گذشتہ پاک و ہند جنگ کے موقع پر ہماری مکمل حمایت کی تھی لیکن آپ نے انڈونیشیا کے موجودہ انقلاب میں جنرل سوہارتو کی تائید کی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

ج۔ سوکارنو نے بلاشبہ گذشتہ جنگ کے موقع پر ہماری حمایت کی تھی۔ ہم اس کے حد درجہ مشکور ہیں ـــــ لیکن سوکارنو کا احسان اپنی جگہ پر ہے۔ اور اس کا غلط

کام اپنی جگہ پر ـــ ہم اس احسان کی وجہ سے اس کے غلط کام کو تو صحیح قرار نہیں دے سکتے۔

(GUIDED DEMOCRACY) کے موجد سوکارنو صاحب ہی تو تھے۔ وہاں آمریت اتنی شدت سے قائم کی گئی تھی جتنی آپ کے یہاں بھی نہیں ہے۔ اسلامی تحریکوں کو ہر ممکن طریق سے کچلا گیا۔ اور کمیونزم کو کھلی چھوٹ دی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے یکایک یلغار کر دی۔ اگر اللہ تعالیٰ کا فضل شامل حال نہ ہوتا۔ تو آج انڈونیشیا کے حالات بالکل مختلف ہوتے۔

قطعِ ید کا مفہوم

س۔ چوری کرنے والے مرد اور عورت کے لئے قرآن میں فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَهُمَا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کا مفہوم صرف ہاتھ کاٹنا ہی نہیں بلکہ ہاتھ باندھنا بھی ہے؟

ج۔ اس طریقۂ تاویل نے ہی دین میں تحریف کا راستہ کھولا ہے یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اگر کسی زبان میں ایک لفظ کسی خاص مفہوم کے لئے وضع کیا گیا ہے، تو آپ کو اسے اسی معنی میں لینا پڑے گا، الّا یہ کہ کوئی ایسا واضح قرینہ موجود ہو۔ جس سے یہ پتہ چلے کہ یہاں لغوی مفہوم مراد نہیں ہے۔

مثلاً جب ہم اردو میں کہتے ہیں کہ ہم نے پھل کاٹا۔ تو اس سے صاف مراد یہ ہوتی ہے کہ یہاں لفظ "کاٹنا" اپنے اصل مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم نے فلاں کے ساتھ تعلقات کاٹ لئے ـــ تو قرینہ یہ بتاتا ہے کہ یہاں یہ لفظ اپنے مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

اب قرآن میں جہاں جہاں بھی قطع کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اصل معنی مراد ہیں۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ قرآن اتر کر آپ کے پاس نہیں آیا تھا۔ بلکہ ایک رسول ؐ کے پاس آیا تھا۔ اس نے اس کے مطابق ایک ریاست قائم کی تھی۔ قوانین نافذ کئے تھے۔ عدالتیں قائم کی تھیں اور روزمرہ کی زندگی کے قواعد ضوابط دیئے گئے تھے۔ پھر اپنے زمانے میں چوری کے مقدمات فیصل کرتے ہوئے ہاتھ کاٹنے کے حکم جاری فرمائے تھے ـــ خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی ہاتھ کاٹے گئے۔ پھر چودہ سو سال تک چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹے جاتے رہے۔ لیکن مسلمانوں میں سے کسی کو بھی اس مسئلے پر اختلاف نہیں ہوا۔ آپ کے اس ملک میں بھی اٹھارھویں صدی تک اسلامی قانون جاری رہا اور انگریزوں کے زمانے میں قطع ید کی سزائیں دی گئیں۔ ان تمام نظائر و شواہد کو بالائے طاق رکھ کر اگر آپ کوئی دوسرا مفہوم لینا چاہتے ہیں۔ تو یہ کہاں کی دیانت ہے؟

متحدہ حزب اختلاف

س۔ متحدہ حزب اختلاف کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے اور وہ کب تک قائم ہوگا؟

ج۔ میں اس کوشش میں لگا ہوا ہوں کہ یہ اتحاد جلد از جلد عمل میں آجائے۔ لیکن کب تک قائم ہوگا؟ ـــ اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

س۔ کونسل لیگ کے انتخابات میں جو دھاندلی ہوئی ہے۔ اس کے پیش نظر کیا جماعت اسلامی سے اس کا اتحاد ممکن ہے ـــ ایک ایسی جماعت جو خود اپنے اندر بھی صحیح جمہوری طریقے سے انتخابات نہ کرا سکتی ہو۔ ملک میں جمہوریت کی بحالی کے لئے کیا فریضہ انجام دے سکتی ہے۔

ج۔ کسی پارٹی میں اگر کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو اس کے کارکنوں کا کام ہے کہ وہ اسے دور کرنے کی کوشش کریں۔ کونسل لیگ یا دوسری جماعتوں سے جماعت اسلامی کا تعاون و اتحاد کوئی ایسی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے ـــ اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے شہر میں پانی کا کال پڑ جائے ـــ اور سب لوگ اس کی فراہمی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں قطع نظر اس کے کہ وہ روزمرہ کی زندگی میں معاون و رفیق ہوں۔ بولنے لکھنے اور

اجتماع کی آزادی جینے کے لئے ضروری ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو کوئی پارٹی بھی کام نہیں کر سکتی۔ ہمیں زندگی کے اس لازمہ کے لئے بہر کیف ایک متحدہ کوشش کرنی ہے ـــ جب یہ مقصود حاصل ہو گیا تو کونسل لیگ، عوامی لیگ اور دوسری پارٹیاں اپنے راستے پر چلیں گی۔ اور جماعت اسلامی اپنی راہ پر۔

س۔ سنا ہے بھٹو صاحب جماعت اسلامی میں شریک ہو رہے ہیں؟

ج۔ مجھے ایسی کسی بات کا علم نہیں ہے۔

اسلامی جمہوریت، پارلیمانی نظام اور انتخابات

س۔ اسلامی جمہوریت سے کیا مراد ہے؟ اور پارلیمانی نظام کی اسلام میں کہاں تک گنجائش ہے؟

ج۔ اسلامی جمہوریت سے کیا مراد ہے؟ ـــ اس کی وضاحت میں اپنی کئی کتابوں میں کر چکا ہوں۔ ابھی حال ہی میں میری کتاب "خلافت و ملوکیت" آئی ہے۔ اس میں یہ بحث موجود ہے ـــ "اسلامی ریاست" میں بھی پوری تفصیل سے اس کی وضاحت کی گئی ہے۔ یہاں مختصراً اس بات کو سمجھ لیجئے کہ

مغربی جمہوریت میں تو قوم کو حاکمیت کا اختیار حاصل ہوتا ہے وہ جس چیز کو چاہے حلال قرار دیدے اور جسے چاہے حرام ٹھہرا دے۔ اس کے برعکس اسلامی جمہوریت میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتی ہے۔ شریعت اسلامی کی برتری تسلیم کرتے ہوئے قوم کو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے حکومت قائم کرے۔ لیکن جس چیز کو اللہ کے قانون نے حرام قرار دیا ہے۔ اسے پوری قوم مل کر بھی حلال نہیں ٹھہرا سکتی اس پابندی کے بعد اسلام میں جمہوریت کو عمل کرنے کا موقع ملتا ہے ـــ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلام میں پارلیمانی جمہوریت نہیں ہے۔ وہ گویا آمرانہ نظام کو تو قرآن سے ثابت کرتے ہیں ـــ اور پارلیمانی نظام کا رد فرماتے ہیں ـــ حالانکہ پارلیمانی نظام ایک ایسا طریقہ ہے۔ جس سے عوام کی مرضی کو صحیح طریقے سے جانچنے کا موقع ملتا ہے

س۔ خلفائے راشدین کو کبھی عوام نے ووٹوں سے نہیں چنا۔ بلکہ چند سربرآوردہ لوگوں نے ان کا انتخاب کیا پھر انتخابات کو کیسے اسلامی قرار دیا جا سکتا ہے؟

ج۔ آج ہمارے ملک میں اس سے بڑھ کر اور کوئی برائی نہیں کہ اسلام کا نام لے کر غیر اسلامی نظام کو رائج کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے ـــ واقعہ یہ ہے کہ خلفائے راشدین نے کبھی خلیفہ بننے کی آرزو نہیں کی۔ بلکہ اس منصب و ذمہ داری کو بڑے تامل کے بعد قبول کیا۔ جن لوگوں نے انھیں چنا وہ قوم کے معتمد حضرات تھے اور عوام نے سوچ سمجھ کر ان کے فیصلے کو مانا۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ کا نام خلافت کے لئے تجویز کیا۔ اور آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ پر بیعت کی ـــ تو پوری امت میں حضرت ابوبکرؓ ہی اس ذمہ داری کو نباہنے کے سب سے زیادہ اہل تھے۔ اگر اس وقت موجودہ انتخابات کا طریقہ رائج ہوتا تو بھی پوری امت حضرت ابوبکرؓ کے حق میں ووٹ ڈالتی۔ جمہوریت کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں لیکن اُن کی روح ایک ہی ہے۔ اور وہ یہ کہ کوئی شخص اپنے جبر سے حکومت پر قابض نہ ہو۔

بعض اوقات جمہوریت کی شکل تو موجود ہوتی ہے۔ لیکن اس میں روح نہیں ہوتی۔ خفیہ رائے دہی بیلٹ بکس اور جمہوری طرز پر انتخاب کی تمام صورتیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ پولیس کے ذریعہ سے رائے دہندوں پر دباؤ ڈالا جاتا ہے ـــ لیکن ان کی پرچیوں پر ان کی مرضی کے خلاف نشان لگا کر صندوقوں میں ڈالا جاتا ہے ـــ اس کے نتیجے میں عوام کی مرضی کے خلاف نمائندہ کامیاب ہو جاتا ہے ـــ بظاہر یہ جمہوری طریقہ ہے۔ لیکن جمہوریت کی اسپرٹ اس میں موجود نہیں ہے۔

ایک ادبی بحث

س۔ آپ نے تفہیم القرآن میں جا بجا "مان کر نہ دینا" کا محاورہ استعمال کیا ہے۔ لیکن لکھنؤ اور دہلی کی دبستان میں تو یہ محاورہ کہیں نہیں پایا جاتا۔ ممکن ہے حیدرآباد دکن میں اس طرح بولتے ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ دکن نے اردو کی بہت خدمت ہے، لیکن زبان تو دہلی اور لکھنؤ کی مستند سمجھی جاتی ہے۔

ج۔ یہ اعتراض وہ لوگ کرتے ہیں جنھوں نے کتابوں سے اردو سیکھی ہے، میری مادری زبان اردو ہے اور میرے باپ دادا سب دہلی کے ہی رہنے والے تھے۔ میرے خاندان میں کوئی آدمی بھی قصباتی نہیں۔ مان کر نہ دینا دہلی والوں کا خاص محاورہ ہے۔ نہ ماننا اور مان کر نہ دینا کا بنیادی فرق یہ ہے کہ نہ ماننا تو ایک سادہ سا انکار ہے لیکن "مان کر نہ دینا" میں ضد اور ہٹ دھرمی پائی جاتی ہے۔ گویا جانتے بوجھتے ہوئے وہ انکار کئے جاتا ہے۔

کان والو سن لو!

کانوں کے جملہ امراض مثلاً کم سننا۔ کانوں سے سائیں سائیں دھم دھم، سیٹی بجنے کی آوازیں آنا۔ پیپ خون مواد بہنا۔ زخم، ورم، درد، خشکی، کھجلی، کانوں کا بھاری پن، سنسناہٹ اور بخاروں کے بعد کام سنائی دینا وغیرہ امراض کے علاج کے لئے اپنے مکمل حالات لکھ کر مشورہ مفت حاصل کیجئے۔

مایوس نہ ہوں

خدانخواستہ آپ یا آپ کا کوئی عزیز دوست کسی بھی مرض میں مبتلا ہے اور کوئی دوا اس پر اثر نہ کرتی ہو اور آپ بالکل مایوس ہو چکے ہوں تو آج ہی اپنی بیماری کے مکمل حالات لکھ کر مشورہ مفت حاصل کیجئے۔ مریض کی تمام خط و کتابت پوشیدہ رکھی جاتی ہے جواب طلب امور کیلئے جوابی کارڈ یا اپنا پتہ لکھا ہوا لفافہ روانہ کیجئے۔

منیجر بھیشم فارمیسی رجسٹرڈ (T-M-P)
ہردوار۔ (انڈیا)

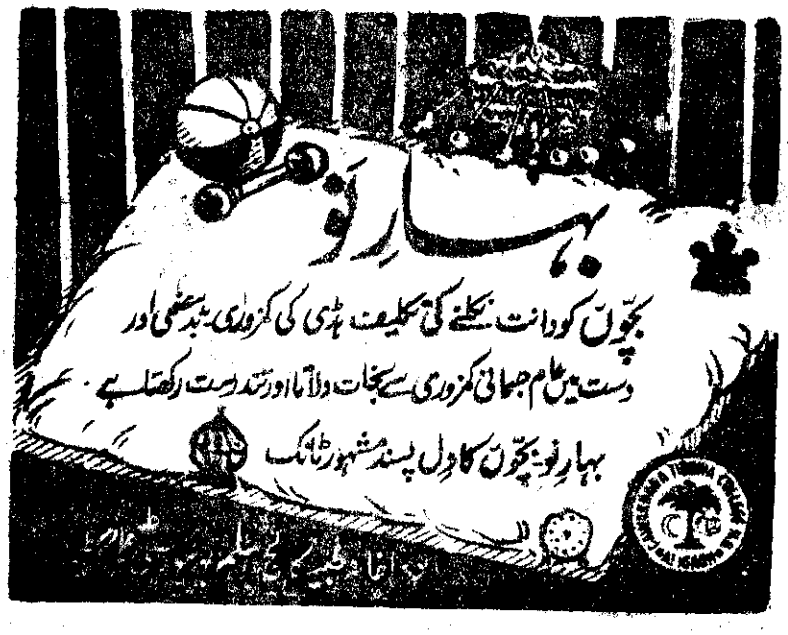

بریدِ فرنگ

ماہنامہ "چراغ راہ" (کراچی) کے مدیر پروفیسر خورشید احمد صاحب جو پاکستان کی اسلام پسند شخصیتوں میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں اسلام کی خدمت اور حالات کے جائزے کی خاطر ۶۶ء میں دیارِ فرنگ تشریف لے گئے تھے۔ وہاں سے انھوں نے جو خطوط کراچی بھیجے ان میں سے چند ملاحظہ فرمائیں۔ ان کا مطالعہ آپ کے لئے خیال افروز ثابت ہوگا۔ (ادارہ)

۱۲ر کی شام کو یہاں کے وقت کے حساب سے ۶ بجے ہوائی اڈہ پر پہنچے اور پونے سات بجے ایک دوست کے یہاں۔ اس لئے کہ ایئرپورٹ پر ہی کہہ دیا گیا کہ کھانا فلاں صاحب کے یہاں ہے اور اس سے فارغ ہو کر آگے جانا ہے۔ مغرب تک تنظیم کے یہاں پہنچے (یعنی ½ ۹ بجے شب، یہاں مغرب اسی وقت ہوتی ہے) رات کو دو بجے تک وہاں نشست رہی اور پھر اپنی قیام گاہ کے لئے روانہ ہوئے۔ ساڑھے تین بجے فجر تھی اس لئے نماز پڑھ کر لیٹے۔ سات بجے لوگوں نے جگا دیا اس لئے کہ ½ ۹ کی گاڑی سے کیمبرج جانا تھا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ گرم پانی سے غسل کر کے چلدیئے وہاں سے رات کو دس بجے آئے۔ کیمبرج میں تین گھنٹے پروفیسر روز نتھال سے گفتگو رہی، لنچ کا بندوبست اسی نے کیا تھا۔ خالص اسلامی یعنی اُبلی ہوئی مچھلی اُبلے ہوئے آلو، سلاد وغیرہ۔ بحث و گفتگو بڑی عمدہ رہی۔ اس سے فارغ ہو کر کیمبرج کی لائبریری دیکھی۔ پھر دو ایک کالج دیکھتا ہوا ایک دوست کے یہاں گیا۔ ملاقات کے لئے وہاں کے تمام احباب جمع تھے۔ دو گھنٹے تک رہی ½ ۸ کی گاڑی سے واپسی ہوئی۔ لندن ساڑھے دس بجے اور ساڑھے بارہ ایک تک ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

صبح نماز کے بعد پھر یہی سلسلہ شروع۔ بڑی مشکل سے تقریر کی تیاری کے لئے کچھ وقت نکالا، اس کے بعد پھر ملاقاتوں کا سلسلہ۔ بمشکل رات کو ½ ۱ بجے لیٹے۔ صبح ۷ بجے نماز اور ۸ بجے پھر برمنگھم کے لئے روانگی۔۔۔۔

لندن اور دوسرے مقامات پر جو وقت گذر رہا ہے اس میں یہاں کے حالات کا جائزہ لینے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں۔ لندن کے بارے میں جو کچھ پڑھا تھا اسے بالکل ویسا ہی پایا۔ وہی کالی عمارات اور نیچے اونچے مکان۔ صاف ستھری سڑکیں اور ہیجانی کیفیت ـــ سوچتا ہوں کہ لوگ بھی عجیب ہیں انکی عمارات باہر سے کالی اور اندر سے خوبصورت ہیں۔ اور یہاں کے انسان باہر سے سفید اور اندر سے سیاہ ہیں۔ ملکوں بلکہ براعظموں کے درمیان فاصلہ کم ہو گیا ہے، لیکن انسانوں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا ہے۔ دو افراد گھنٹوں پاس بیٹھے رہیں گے لیکن ایکدوسرے سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ انگریز قوم بھی عجیب ہے۔ ہر لحاظ سے INTROVERT دوسرے میں دلچسپی لینا یہاں حرام ہے۔ آپ کے پاس ایک شخص بیٹھا رہے گا اور

اخبار سامنے رکھے گا، کنکھیوں سے آپ کو دیکھتا بھی رہے گا۔ لیکن بات چیت نہیں کرے گا۔ غیر انگریزوں سے نہیں، انگریزوں سے بھی۔ یہ لوگ اخبار کو پڑھتے کم اور اس سے ڈھال کا کام زیادہ لیتے ہیں۔ یہاں کے لوگ پانی اور طہارت کے تصور سے ناآشنا ہیں۔ ان کی صفائی ستھرائی بھی بس نام کی ہے۔ نہلانے سے ان کے فرشتے بھاگتے ہیں بلکہ میرے خیال میں تو اب بدبو سے بھاگ گئے ہوں گے۔ منھ چپڑ لیتے ہیں اور پوڈر بدن پر مل لیتے ہیں اور اس طرح غسل کی جگہ پر عامل ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس سے گذرو تو بدبو محسوس ہوتی ہے۔ کاغذ کا استعمال اس بری طرح کرتے ہیں کہ کیا کہا جائے۔ مکانات پر سفیدی کے بجائے دیواروں پر کاغذ چپکاتے ہیں۔ ہر چیز کے لئے کاغذ کی تھیلی ہے۔ کھلے اور چھپے ہر کام کے لئے کاغذ ہے۔ غالب کی بات کی صداقت یہاں آکر محسوس ہوتی ہے کہ:-

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

یہاں کا ہمارے روپے سے بھی بڑی سکہ ہے۔ ہر کام کے لئے اس کی ضرورت ہوتی ہے ٹیلیفون کرنا ہو تو ۳ پینی ڈالدو۔ چائے پینی ہو تو چھ پینی ڈالدو چاکلیٹ چاہتے ہو تو اتنی پینی، حتی کہ بیت الخلاء استعمال کرنا ہو تو ایک پینی ڈالدو۔ ہر چیز کی کلید یہاں پیسہ ہے۔ اس چابی کے بغیر کوئی راستہ نہیں کھلتا۔ یہ چیز محض نہیں، بلکہ یہاں کے تمدن کی ایک علامت ہے۔

برمنگھم میں کانفرنس بہت کامیاب رہی۔ الحمدللہ علیٰ ذالک بڑی قیمتی تنظیم ہے۔ بڑے باصلاحیت، ذہین اور قیمتی طلبہ کو اس نے منظم کیا ہے۔ ۸۰٪ فیصد طلبہ پی ایچ ڈی کرنے والے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے۔ کوئی ۵۰٪ آرٹس سے متعلق ہیں۔ اور باقی ۵۰٪ گریجویشن کے ہیں۔ یہاں کی دس یونیورسٹیوں میں اس کی باقاعدہ شاخیں ہیں۔ اس دفعہ کانفرنس میں ۱۵۰ مندوبین تھے جن کا تعلق بیس ممالک سے تھا نائیجیریا سے لیکر ترکی تک کے۔ سب سے زیادہ طلبہ ترک اور شامی تھے۔ دل چاہتا ہے کہ پوری تفصیل سے ایک ایک ملک کے حالات لکھوں۔ بہت ہی امید افزا حالات ہیں اور خدا کا فضل ہے کہ ان طلبہ میں سے جو الحاد کے اس مرکز میں آئے تھے، خدا کے کلمہ کو بلند کرنے والے نکل رہے ہیں۔ ہر روز صبح سے لیکر رات کو ڈیڑھ بجے تک ملاقاتیں، تقاریر، کمیٹی کی میٹنگیں وغیرہ رہیں۔ میری دو تقریریں ہوئیں، اور خدا کا احسان ہے کہ دونوں کامیاب رہیں۔

---

۱۸ ار کو کانفرنس ختم ہوئی۔ اس کے بعد انگلستان کے دورہ کا پروگرام شروع ہو گیا۔ ۱۹ ار کو ایڈنبرا گیا اور پروفیسر واٹ سے ملاقات کی۔ اسی دن شام کو گلاسگو آگیا۔ یہاں انفرادی ملاقاتوں کے علاوہ ایک تقریر یونیورسٹی میں اور ایک یہاں کی مسلم کمیونٹی میں کی ہے۔

گلاسگو کے بعد شیفلڈ آیا۔ یہاں یونیورسٹی یونین کے ہال میں تقریر کرنا تھی۔ غیر مسلم بھی تھے۔ موضوع تھا:-

"اسلامی ریاست کے اصول"

مشنری اداروں سے بھی ایک صاحب تشریف لائے تھے۔ تقریر ڈیڑھ گھنٹہ کی اور اس پر بحث و مباحثہ دو گھنٹہ کا رہا۔ الحمدللہ نہایت کامیاب۔ افسوس کہ ٹیپ نہ ہو سکا اگلے دن رجسٹرار سے ملاقات رہی، پھر جمعہ کا خطبہ۔ درمیان میں شہر دیکھا۔ یہ ایک صنعتی شہر ہے اور صنعت کی چھاپ ہر چیز پر نمایاں ہے۔ البتہ شہر کے باہر مضافات کا علاقہ بہت خوبصورت ہے۔ ضمناً یہ بھی سن لو کہ یہاں راتوں کا استعمال کراچی سے بھی بڑھ کر ہوتا ہے۔ گیارہ بارہ بجے تک تو بحث و مباحثہ ہی رہتا ہے۔ پھر گھر آکر "ملاقات" شروع ہوتی ہے اور بالعموم فجر کی نماز کے بعد ہی یہ سلسلہ "باکراہ" ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ۲، ۲½ گھنٹے بمشکل لیٹنے کو ملتے ہیں کہ پھر دن کا پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔ اب تک سات آٹھ راتیں پوری کی پوری اسی طرح گذار چکا ہوں۔

وہاں سے مانچسٹر آئے، وہی مانچسٹر جس کا کپڑا کبھی مشہور تھا اور جس کے کپڑے کی صنعت کی اہمیت اب آہستہ آہستہ ختم ہوتی جارہی ہے۔ یہاں مسلمانوں کی اچھی آبادی ہے، کوئی دس ہزار لیکن مزدور پیشہ ہیں۔ طلبہ میں اسلامی تحریک خاصی مضبوط ہے۔ خصوصیت سے ترک طلبہ تو بہت ہی پُرجوش ہیں۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ رات گئے تک رہا۔ اگلے دن صبح یونیورسٹی دیکھی اور پھر شام کو تقریر تھی۔ یہ جلسہ سیرت النبیؐ کے سلسلے میں تھا۔ "لائف اینڈ مشن آف محمدؐ" کے عنوان پر ایک گھنٹہ بولا۔ ٹاؤن ہال ہی میں جلسہ تھا، تین چار سو حاضری ہوگی۔ طلبہ کے علاوہ عام لوگ بھی کافی تھے۔ بحث ومباحثہ گیارہ بجے تک رہا۔ اس کے بعد یو، کے، اسلامک مشن کا جلسہ تھا۔ رات کو پونے دو بج گئے۔ دو بجے کہیں ہم کھانا کے لئے بیٹھے اور ۳ بجے فجر کی نماز پڑھ کر کچھ لیٹے کہ ۹ بجے بریڈفورڈ کے لئے روانہ ہونا تھا۔

۹ کی گاڑی نکل گئی اس لئے کار سے گئے۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ COUNTRY SIDE دیکھنے کا موقعہ مل گیا۔ بریڈفورڈ میں تقریر نہ تھی صرف چاء پر معززین شہر (مسلمان) سے ملاقات تھی۔ ۲۰، ۲۵ لوگ تھے۔ دو ڈھائی گھنٹے گفتگو رہی۔ پھر انفرادی ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ہم لوگ کار ہی سے مانچسٹر واپس آگئے اور یہاں سے بجلی کی ٹرین سے لندن کے لئے روانہ ہوگئے۔ الحمدللہ اس پورے سفر میں دعوتی کام برابر ہوتا رہا۔ تقاریر کے ذریعے اور ان سے زیادہ گفتگو اور ملاقاتوں کے ذریعے۔ یہاں طلبہ میں اعلیٰ صلاحیت کے بڑے اچھے نوجوان ہیں جن کا اسلامی جذبہ بھی مُردہ نہیں ہے اور ان پر خاطر خواہ توجہ دیکر انھیں دنیا میں اسلام کا قیمتی ترین اثاثہ بنایا جاسکتا ہے۔ اپنی حد تک یہی کوشش کی ہے کہ ایمان کی چنگاری کو زیادہ سے زیادہ روشن کیا جائے۔ آگے خدا کے ہاتھ میں ہے۔ السعی منا وتمام من اللہ۔

لندن میں صرف رات گذاری۔ یہاں کے روایتی اندازہ کے مطابق ۱۲½ بجے تو گھر پہنچے پھر کھانا کھایا، نماز پڑھی۔ سوتے سوتے دو بج گئے۔ صبح ہی آکسفورڈ جانا تھا۔ یونیورسٹی گیا۔ لائبریریاں دیکھیں، ہال دیکھے، پھر ایک دوست کے گھر گیا، شام کو ۸ بجے LINCOLN COLLEGE میں تقریر تھی۔ سوا گھنٹہ کی تقریر "اسلام از دی سپریم آئیڈیالوجی" اور دو گھنٹے کا بحث ومباحثہ۔ حاضری ۵۰، ۵۵ کے قریب تھی جس میں تین پروفیسر اور ۶، ۵ غیر مسلم طلبہ بھی تھے۔ باقی عرب اور پاکستانی تھے۔ ہمارے معیار سے حاضری کم تھی، لیکن وہاں کے معیار سے غیر معمولی طور پر زیادہ! مباحثہ کا معیار نہایت بلند تھا۔ طبیعت خوش ہوگئی اور جوابات دینے کے لئے "ذہنی مشق" بھی کافی کرنا پڑ گئی۔ آکسفورڈ کا ذہنی معیار اب بھی پورے انگلستان سے بلند ہے۔ دنیا جہان کے ہر موضوع پر سوالات تھے، لیکن خدا کا احسان ہے کہ پروگرام نہایت کامیاب رہا۔

اگلے دن لندن واپس آئے۔ رات کو پہلی بار لندن کے احباب سے ملاقات رہی۔ اب تک تو لندن بس PARKING PLACE رہا ہے۔ صبح ۱ بجے جرمنی کے لئے روانہ ہوگیا ——— ۲۷ کو فرینکفرٹ میں پروگرام رہا۔ شام کو تقریر تھی۔ "اسلام اور تہذیب جدید"۔ صبح ہی آفن کے لئے روانہ ہوگیا۔ یہاں شام کو پہنچا اور ایک گھنٹہ بعد تقریر کرنے چلا گیا۔ ڈیڑھ گھنٹے کی تقریر اور دو گھنٹے کا مباحثہ رہا۔ اب کل UMSO (یونائیٹڈ مسلم اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن ان یوروپ) کے کیمپ میں بروشوائیک جارہا ہوں۔ اس تنظیم میں مسلمانوں کی ۴۸ تنظیمیں شریک ہیں۔

آج شام یہاں کانفرنس میں "دعوتِ اسلامی کے امکانات اور اس کا مستقبل" پر تقریر ہے۔ رات کو برلن جاؤنگا وہاں "اسلامی ریاست میں شوریٰ کا نظام" پر تقریر ہے۔ یہ پاکستان سوسائٹی کے تحت ہوگی۔

میونخ میں تقریر کا موضوع "جماعت اسلامی اور

اخوان المسلمون

پہنچے۔ ۱۵ر اگست کو روم کے لئے روانہ ہوں گا اور ۹ر کو وہاں سے اسپین چلا جاؤں گا "تہذیب حجازی کا مزار" دیکھنے۔ دل ابھی سے خون کے آنسو رو رہا ہے۔ وہاں سے انشاء اللہ لندن واپس آؤنگا

جرمنی میں میں فرینکفرٹ ۲۷ر جولائی کو دوپہر کے وقت پہنچا' بذریعہ ہوائی جہاز۔ بیشتر سفر ہوائی جہاز سے ہی کر رہا ہوں اس لئے کہ وقت بچانے کا کوئی اور ذریعہ نہیں۔ دوسرے یہاں ریل اور جہاز کے کرائے میں زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔ ہوائی جہاز کا کرایہ ڈیڑھ گنا ہے سیکنڈ کلاس کے کرایہ کا۔ ریل میں صرف درجہ اوّل اور دوئم ہوتا ہے۔ میں جیٹ کے بجائے وائی کاؤنٹ سے سفر کر رہا ہوں۔ فرینکفرٹ دریائے مین' (MAIN) کے کنارے جسے یہ لوگ ماٹن کہتے ہیں آباد ہیں۔ فرینک اس قبیلے کا نام ہے جو یہاں اولاً آباد ہوا تھا اور فرٹ کہتے ہیں اس جگہ کو جہاں پانی پایاب ہو اور اس میں سے چل کر جایا جا سکتا ہو۔ یہ شہر جنگ میں جزوی طور پر تباہ ہوا تھا' مگر بعد میں اسے کافی وسعت حاصل ہوئی ہے۔

ہم ایک ہوٹل میں ٹھیرے شام کو تقریر تھی۔ آنے کے تھوڑی ہی دیر بعد بارش شروع ہو گئی۔ پورے یورپ کا حال ایک ہی جیسا ہے۔ پتہ نہیں ہوتا کہ کب بارش شروع ہو جائے۔ ابھی دھوپ ہے اور ابھی موسلا دھار بارش شروع۔ ان اقوام کی سیاست اور ان کا موسم دونوں ناقابل اعتبار ہیں۔ گھڑی میں کچھ' گھڑی میں کچھ۔ شام کو غیر ملکی طلبہ کے ہوسٹل کی عمارت میں تقریر رہی۔ حاضری کم تھی' کوئی بیس طلباء۔ ایک لوکل جرمن مسلمان عبدالشکور۔ ترجمہ کے ساتھ تقریر کا پہلا اتفاق تھا۔ کئی تجربے کرنا پڑے۔ پہلے ایک ایک پیراگراف کا ترجمہ کرایا پھر ایک ایک جملہ پر آنا پڑا۔ رات گئے پروگرام ختم ہوا۔ اگلے دن صبح ہی آخن کے لئے روانگی ہو گئی۔ پانچ بجے پہنچے۔ ساڑھے چھ بجے تقریر تھی۔ یہ پروگرام الحمد للہ بہت کامیاب رہا۔ ایک رفیق اختر صاحب نے ترجمہ کیا جو بہت اچھا تھا۔ تقریر بمعہ ترجمہ ۲ گھنٹے اور سوال جواب کوئی ۲ ½ گھنٹے رہے۔ ۱۱ بجے فارغ ہوئے پھر کچھ کھایا۔ یہاں حاضری ۵۵' ۶۰ تھی۔ یہ غیر معمولی طور پر اچھی تھی۔ ورنہ یہاں کے بڑے بڑے اجتماعات کے بارے میں ان حضرات کی روایت یہ ہے کہ ۴۰ سے زیادہ نہیں ہوتی یہاں کے اخبارات نے بھی دلچسپی لی۔ تقریر چھاپی' اپنا نمائندہ جلسہ میں بھی بھیجا۔ صبح کو کوئی پروگرام نہ تھا' لیکن تھکن بے پناہ تھی اس لئے نماز کے بعد لیٹ گیا۔ دیر سے ناشتہ کیا۔ پھر یہاں کا سینٹر دیکھنے چلا گیا اس کے بعد جمعہ کا خطبہ دینا تھا۔ سخت مشکل تھی۔ ۹۰ فیصد عرب طلبا اور خطبہ یاد نہ تھا۔ جان چھڑانے کی کوشش کی لیکن یہ لوگ نہ مانے۔ انگریزی میں تقریر کی۔ والعصر پر آیات اور احادیث زیادہ سے زیادہ استعمال کیں۔ پھر مختصر ترین خطبہ عربی میں دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے عزت رکھ لی نماز کے بعد SIGHT SEEING پروگرام تھا' کوئی ۴۰' ۵۰ کلومیٹر پر ایک جھیل ہے اسے دیکھنے گئے۔

موسم ہمارے اعتبار سے بہت اچھا تھا۔ بادل اور ہلکی پھوار' اور یہاں کے اعتبار سے خراب تھا۔ بار بار یہ لوگ یہی کہتے تھے کہ اگر دھوپ ہوتی تو لطف آجاتا۔ ہمارا اور ان کا مذاق کتنا مختلف ہے۔ موسم سے لطف اندوزی کے اعتبار سے بھی ہمارے ذوق جدا جدا ہیں۔ بات نکل آئی ہے تو سن لو کہ اس اعتبار سے سخت کوفت ہوتی ہے۔ آج تک انگلستان و جرمن اور اٹلی تینوں ممالک میں کوئی شخص ایسا نہیں ملا جو پانی کا ذوق رکھتا ہو۔ لوگوں کے پاس ہیں' لیکن ٹھنڈا پانی نہیں پیتے۔ گھر سے جو ٹھنڈا پانی پی کر چلا تھا اس کو اب تک ترستا ہوں۔ ٹھنڈا پانی مانگتا ہوں تو لوگ منھ تکتے ہیں۔ چلو ٹھنڈا پانی نہ سہی گرم ہی سہی' لیکن چاء کا جتنا خراب ذوق یہاں ہے شاید ہی کہیں اور کا ہو۔ انگلستان کو لو۔ نہ ایک صدی پہلے انھیں چائے پینی آئی اور نہ آج ـــ جب پانی پھینک دیا کرتے تھے اور تیل کھا لیا کرتے تھے۔ اب پیتے تو پانی ہیں لیکن اس قدر بدسلیقگی سے کہ چائے سے کراہت ہو جائے اور ستم بالائے ستم کہ چائے میں ٹھنڈا دودھ ڈالتے ہیں۔ چائے کیساتھ گرم دودھ گویا ایک بدمذاقی ہے!

بہرحال میری بات دوسری طرف نکل گئی۔ رات گئے

تک احباب سے ملاقاتیں اور مختلف تحریکی ادوار پر گفتگوئیں رہیں۔ صبح ہی چھ بجے کار کے ذریعے برانشور کیلئے روانہ ہوگئے۔ یہ سفر صبح چھ بجے شروع ہوا اور ڈیڑھ بجے منزلِ مقصود پر پہنچے۔ جرمن کی شہرہ آفاق سڑک AUTOBAN پر سفر کا اتفاق ہوا۔ سڑکوں کا یہ جال پورے جرمنی میں پھیلا ہوا ہے۔ دو سڑکیں ایک سمت میں جانے کے لئے بیچ میں منڈیر یا لوہے کے BARRIER اور دو سڑکیں واپس آنے کے لئے۔ شہریوں کے پاس یہ بالعموم تین تین سڑکیں ہوجاتی ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس سڑک پر کہیں موڑ نہیں ہے یعنی SHARPTURN اور نہ کوئی سڑک کسی بھی مقام پر ویسے CROSS کرتی ہے۔ یعنی گاڑی کسی رکاوٹ کے بغیر دور کسی اور سمت سے کسی اور گاڑی کا مقابلہ کئے بغیر جاسکتی ہے۔ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شہروں کے پاس مڑنے کے لئے خصوصی انتظامات ہیں۔ لیکن ROAD CROSSING کے بغیر۔ ایک جال سا ہوتا ہے۔ ایک دلچسپ اختراع یہ ہے کہ جو نازک مقامات ہیں وہاں سڑک پتھروں کی ہے۔ خصوصیت سے جب آپ AUTOBAN آٹوبان سے شہر میں داخل ہوتے ہیں تو سڑک پلاسٹر کے بجائے پتھروں کی ہے جس کی وجہ سے گاڑی اگر تیز ہو تو بہت زیادہ اُچھلنے لگتی ہے اور ہر شخص مجبور ہوتا ہے کہ رفتار کم کرے۔ یہ حربہ شہروں میں بھی استعمال کیا گیا ہے اور اہم CROSSING پر یا نازک مقامات پر ایسا کیا گیا ہے۔ اب پورے یورپ اور امریکہ میں اس طرز پر سڑکیں بن رہی ہیں۔ اٹلی میں بھی اس قسم کی سڑک بنی ہے۔

اور ان پر دونوں سمتوں میں تین تین سڑکیں ہیں۔ ان پر ایک سے ایک تیز رفتار گاڑی جاتی ہے۔ ہم جس گاڑی سے آئے وہ بھی ۱۲۰ کلومیٹر اور ۱۵۰ کلومیٹر تک کی رفتار سے آئی۔ حادثات ان سڑکوں پر بھی ہوتے ہیں۔ یہ بات عجیب محسوس ہوئی کہ ویسے تو عورتیں گاڑیاں خوب چلاتی ہیں، حد یہ ہے کہ ٹیکسی ڈرائیور بھی ہیں لیکن آٹوبان پر شاذ شاذ ہی کوئی عورت ڈرائیو کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور وہ بھی بالعموم نسبتاً کم رفتار سے۔

عورت فطرت کے قانون کو توڑنے کی کتنی ہی کوشش کرے، اسے فطرت کی بالادستی تسلیم کرنی ہی پڑتی ہے!

ہمارا جہاز ۴۵/۱۱ پر میونخ سے روانہ ہوا۔ خیال تھا کہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں روم پہنچ جائیں گے۔ لیکن معلوم ہوا کہ جہاز براستہ وینس جائے گا۔ ½ ۱ گھنٹے میں وہاں وینس پورٹ ہے شیکسپیئر کا مرچنٹ آف وینس یاد آرہا تھا کبھی یہ دنیا کی اہم ترین تجارتی بندرگاہوں میں سے تھی۔ ہوائی اڈہ سمندر کے کنارے ہے۔ جہاز کے اُترنے کا منظر بڑا دل کش تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندر ہی سے چھلانگ لگا کر ایر سٹرپ AIR STRIP پر آیا ہے۔ یہاں ۵۰ منٹ انتظار کیا گیا۔ بارش ہو رہی تھی۔ اس لئے پورٹ کے ایک حصہ ہی میں رہے۔ پھر نئے جہاز سے روم کے لئے روانہ ہوگئے۔ روم کے ہوائی اڈہ پر جہاز ۵ بجے شام پہنچا۔ بس سے ایر ٹرمینل آئے، لیکن ہوائی کمپنی کی بس بھی یہاں کرایہ لیتی ہے ۸۰۰ لیرا یعنی سرکاری شرح پر کوئی سات روپے۔ ٹرمینل سے ہوٹل تک کے ٹیکسی نے ۷۰۰ لیرا لئے۔ اگر ایر پورٹ سے ٹیکسی میں آنے کی حماقت کرتا تو شاید ۵-۶ ہزار لیرا دینے پڑتے۔ یہاں گرانی ہوش رُبا ہے۔ تین چار ہی دن میں حال پتلا ہوگیا۔ اوسط درجے کا ہوٹل ۵ اور ۷ ڈالر روزانہ پر ملتا ہے اور اس میں کھانا شامل نہیں ہے۔ کوکا کولا ۲۰۰ لیرا کا ہے۔ پانی کا ایک گلاس ۳۰۰ لیرا کا ملتا ہے۔ ایک بار پانی پینے کی حماقت کی تھی۔ اس کے بعد سے کوکا کولا ہی پیتا ہوں۔ ہمارے ہوٹل میں چائے کی ایک پیالی ۲۰۰ لیرا کی اور ایک کا کھانا ۱۶۰۰ لیرا کا ہے۔ میں نے تو آسان راستہ نکالا۔ باہر جاکر ایک معمولی سے کیفے میں ٹماٹر کے دو سینڈوچ بنواتا ہوں اور ½ ۱ مینٹ دودھ لیکر پی لیتا ہوں۔ ناجائز کے چکر سے بھی الحمدللہ بچ جاتا ہوں اور ۴۰۰ لیرا میں کام بن جاتا ہے۔ ایک کیلا ۱۰۰ لیرا کا (کم سے کم) ملتا ہے، کبھی وہ لے لیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے

ان کے لئے بھی سامان فراہم کیا ہی ہے جو اس کی حدود کا خیال رکھنا چاہتے ہیں۔

آتے ہی ..... اور C/T سے مل کر پروگرام طے کیا۔ رات کو ان کی بس میں روم کا چکر لگایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آدمیوں کا سمندر ہے جو سڑکوں پر ٹھاٹھیں مار رہا ہے بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ یہاں کا معمول ہے۔ عجیب بے فکرے لوگ ہیں۔ صبح کام پر جاتے ہیں دوپہر تک چھٹی ہو جاتی ہے۔ کھانے کے بعد LONG-SLEEP کرتے ہیں اور شام کو باہر نکل آتے ہیں۔ یہاں نہ صرف سڑکوں پر کھانا معیوب نہیں بلکہ مطلوب ہے۔ ہوٹل باقاعدہ فٹ پاتھ پر آباد ہیں۔ چھتریاں لگی ہوئی ہیں اور شراب کے دور چل رہے ہیں۔ چائے اور کھانے کا انتظام بھی اسی طرح ہے۔ جگہ جگہ فوارے ہیں اور ان پر ٹھٹھ کے ٹھٹھ۔ جو زیادہ امیر ہیں وہ اونچے ہوٹلوں اور کلبوں میں جاتے ہیں جو اتنا نہیں خرچ کر سکتے وہ سڑکوں پر پھرتے ہیں، پارکوں کا رخ کرتے ہیں اور فوّاروں پر جا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ رات کے بڑے حصّے میں ان کا یہی معمول رہتا ہے۔ دکانیں بند ہیں اور سڑکوں پر آدمیوں کا سیلاب رواں دواں ہے۔ یہاں پانی مہنگا اور نایاب اور شراب ارزاں اور ہر طرف دستیاب ہے۔ مجھے تو پورا روم ایک بڑا شراب خانہ معلوم ہوتا ہے جس میں ہر طرف میخوار بدمست نظر آتے ہیں!

میں نے COCH کے ذریعہ چار TRIPS میں شہر کے تاریخی مقامات دیکھے اور C/T کے ایک ٹرپ کے ذریعہ NAPPLE اور POMPIE کا علاقہ دیکھا۔ زبان نہ جاننے کے باعث اور وقت بے حد کم ہونے کی وجہ سے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ پھر خود سفر کرنے پر خرچ اور بھی زیادہ ہوتا ہے اس لئے یہی بہتر معلوم ہوا۔ حالانکہ اس پر بھی ۲۰، ۲۲ ہزار لیرا خرچ ہو گئے۔ روم کے مشاہدے سے ان بے شمار چیزوں کی تصدیق ہو گئی جو آج تک اس تمدن کے بارے میں پڑھی تھیں۔ میرے لئے یہ سفر بڑا سبق آموز رہا ہے۔ گو میں نے یہاں گذارے تو چار ہی دن لیکن جو کچھ پڑھ رکھا تھا اس کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میں نے ایک مدت ان کے درمیان گذاری ہے۔ البتہ جو بات مطالعہ سے معلوم نہ ہوئی تھی، وہ اس قوم کا عجیب و غریب مزاج، ان کی تہذیب میں بت پرستی کا مقام اور عیسائیت کے انحطاط کی نوعیت ہے۔

روم کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے بت اور مجسمے ہیں۔ ہر طرف ان کی قطار نظر آئے گی جس کے احسان کا اس نے اعتراف کرنا چاہا۔ اس کا مجسمہ آویزاں کر دیا۔ یہاں ۳۰۰ کلیسا ہیں اور ۴۰۰ فوارے۔ لیکن نہ کلیسا ان کے دلوں کو پاک کر سکتے ہیں اور نہ فوارے ان کی سیاہی کو دھو سکتے ہیں۔ شرک ان کی رگ رگ میں بسا ہوا ہے اور یہاں آ کر اندازہ ہوا کہ قرآن نے شرک کو نجس کیوں کہا ہے؟ صرف اعتقاد ہی میں یہ نجس نہیں بلکہ پوری زندگی کو نجاست سے آلودہ کر دیتا ہے۔ اسلام نے مجسمہ سازی کی جو مخالفت کی ہے اس کی حکمت کا اندازہ یہاں آ کر ہوتا ہے جس پیمانے پر یہاں مجسمے پائے جاتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس قوم کا اعتقاد آخرت پر تھا ہی نہیں! دنیا میں سب کچھ حاصل کرنے کا جذبہ مجسمہ سازی میں صاف کارفرما محسوس ہوتا ہے۔ بڑے بڑے پادری خود اپنے بت بنواتے ہیں اور اس طرح دوام پانا چاہتے ہیں اور ذرا آنکھیں اٹھا کر اس شہر میں رومن قوم کو نہیں دیکھتے جس کے کھنڈرات زندگی کی بے ثباتی اور دنیا کی ہر چیز کی زوال پذیری کی داستانیں سناتے ہیں۔ میرے لئے یہ کھنڈرات دلچسپی کا بڑا سامان رکھتے ہیں۔ رمتہ الکبریٰ کو ٹوٹے ہوئے محلات، منہدم ستونوں، اکھڑی ہوئی قبروں اور ملبے کے ڈھیر میں تلاش کرتے ہوئے عجیب کیفیت ہوئی۔ یہاں کی ہر محراب تاریخ کا ایک ورق ہے۔ ہر ستون پر موعظت کا ایک سبق اور ہر پتھر پر عبرت کی داستان لکھی ہوئی ہے۔

روم کے ان کھنڈرات سے ایک ایسی تہذیب کا پتہ چلتا ہے جو اپنے ..... کے اعتبار سے آج کی تہذیب سے کم نہ تھی ـــــ اس کا COLLORIUM آج کے بڑے سے بڑے SKY-SCRAPPER STADIUM

سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ لیکن اسے یہ تمام چیزیں قدرت کے قانون سے نہ بچا سکیں۔ افسوس ہے کہ آج کا انسان رومن قوم اور پلپائی کے کھنڈرات کو بھی سیر و تفریح کے لئے دیکھتا ہے اور یہ نہیں محسوس کرتا کہ یہ ایک آئینہ ہیں جن میں ہر تہذیب اپنا مستقبل دیکھ سکتی ہے۔ گاتیڈ نے تین گھنٹے تک ان آثار کی تاریخ پر روشنی ڈالی، لیکن کہیں بھی ان سے جو سبق حاصل ہوتا ہے اس کا شعور نہ تھا لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اذان لا یسمعون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا کی کیفیت نظر آتی ہے۔

یہ شہر مسیحی تہذیب کا مرکز ہے اور میں نے اس پہلو سے اس کا خاص طور پر مطالعہ کرنے کی کوشش کی۔ تمام اہم کلیساؤں میں گیا۔ ان کے بت دیکھے اور مجسمے۔ ان کی تقریریں، ان کی عمارتیں سب دیکھیں اور ان سے عیسائیت کے انحطاط اور تضادات کا احساس بے حد شدید ہو گیا۔ عجیب لوگ ہیں کہ عورتوں کے لئے تو پابندی لگاتے ہیں کہ ان کلیساؤں میں آستینیں کھلی قمیصیں پہن کر نہیں آسکتیں اور ان کو اس کے اوپر رومال ڈالنا ہوگا۔ لیکن انہی کلیساؤں میں مردوں اور عورتوں کی بالکل برہنہ تصاویر بکثرت موجود ہیں۔ ایسے مجسمے سیکڑوں کی تعداد میں ہیں جن پر ایک انجیر کے پتے کے سوا کوئی لباس نہیں۔ ان کا کلیساؤں میں خدا پرستی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ دنیاوی وجاہت بے پناہ ہے اور پھر خالص مادی اور حسی مظاہر ہیں۔

دل چاہتا ہے کہ ان تصاویر اور کلیسا کے ان پہلوؤں پر تفصیل سے لکھوں۔ میں نے معلوم کیا کہ ان ۳۰۰ کلیساؤں میں عبادت کرنے کتنے آتے ہیں؟ معلوم ہوا کہ ۱/۱۰۰ بھی نہیں جو دیکھنے آتے ہیں۔ عیسائی مذہب اب یہاں SIGHT-SEEING کی ایک چیز ہے۔ زندگی کی صورت گری کرنے والی قوت نہیں۔ اور کلیسائی دنیا پرستی اس کے اسباب میں ہے۔ VATIC ACITY اب خود STATE ہے جس کا اپنا سکہ، ٹکٹ، پولیس وغیرہ ہے۔ سولھواں چرچ بھی دیکھا بڑا شہرہ تھا۔ ہے تو بے حد خوبصورت اور جاذب نظر لیکن ایک میوزم اور آرٹ گیلری کی حیثیت سے۔ عبادت گاہ کی حیثیت سے نہیں! اور یہی مذہب کا حزنیہ ہے۔

انشاء اللہ کل صبح اسپین کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔ روم سے مایوس مگر باخبر جا رہا ہوں۔ دیکھو اسپین میں دل پر کیا گذرتی ہے، اپنی لٹی ہوئی دنیا ہے!

یکم کی صبح کو ماورد MEDRID کے لئے روانہ ہوا ڈیڑھ بجے (گرینیچ ٹائم) اور یہاں کے ساڑھے بارہ بجے جہاز پہنچا۔ ماورد میں ٹھیرنے کا خیال نہ تھا۔ لیکن غرناطہ کے لئے کوئی جہاز نہ تھا اور جو جہاز نہ تھا اور جو جہاز تھا وہ اشبیلہ لے جاتا، وہاں سے پھر واپس آنا پڑتا اس لئے رات کی گاڑی سے سفر کیا۔ سیٹ بک کرالی۔ گاڑی رات کو پونے دس بجے چلتی تھی۔ ہوٹل میں جگہ لینا وقت اور پیسے کا ضائع کرنا تھا اس لئے سامان اٹرٹر مینل پر جمع کرایا اور تھاور کلوک کے ایک ٹرپ کے ذریعے ماورد کا نصف حصہ دیکھ لیا۔ ویسے تو بڑا اچھا شہر ہے، جدید طرز پر فروغ پا رہا ہے مگر مجھے کوئی خاص بات محسوس نہ ہوئی۔

رات کو غرناطہ کے لئے روانہ ہوا۔ نصف شب کے کچھ ہی دیر بعد آنکھ کھل گئی۔ نیند غائب تھی، طبیعت میں سخت اضطراب تھا۔ اپنی بربادی کے آثار اپنی آنکھوں سے دیکھنے ہوں گے۔ اندلس سے ہم نے عروس مغرب بنایا تھا، آج غیروں کے قبضہ میں ہے۔ ماورد بھی مسلمانوں کے قبضہ میں رہا ہے۔ اسکے قریب تولیدو TOLEDO تو ہمارا ایک چھوٹا مرکز رہا ہے لیکن چونکہ یہ شہر تقریباً پورا عیسائی دور اقتدار میں آباد ہوا ہے۔ اس لئے وہاں دل کی یہ کیفیت نہ تھی، مگر اضطراب تو اسپین کا پروگرام بنانے کے وقت ہی سے تھا۔ نماز پڑھنے بیٹھ گیا کہ شاید اس سے ہی کچھ سکون آئے۔ طلوع سحر کا پورا منظر دیکھا۔ پہاڑی علاقہ ہے کچھ کچھ ریگستانی کیفیت ہے۔ معاشی اعتبار سے بالکل پس ماندہ ہے۔ خصوصیت سے دیہی علاقہ۔ زراعت ہے۔ جیسے جیسے غرناطہ قریب آیا سبزی میں اضافہ ہونے لگا۔ پہاڑوں کے پس منظر میں ریت اور کہیں کہیں سبزہ

سبزہ میں سرو کے درخت اس پر سورج کی پہلی کرنیں ـــــ کبھی انھی راستوں سے طارق اپنے مجاہدوں کے ساتھ آیا تھا۔ انھی پہاڑوں، ریگ زاروں اور سبزہ زاروں نے اس کا استقبال کیا تھا۔ یہاں اذان کا غلغلہ بلند ہوا تھا اور اس زمین کے چپہ چپہ پر مسجدوں کے ذریعہ عبادت الٰہی کے نقوش ثبت ہوئے تھے۔ ایک دن وہ لوگ آئے تھے اور آج ہم آرہے ہیں۔ لیکن کتنا فرق ہے دونوں میں ـــــ وہ اسلام کا جھنڈا بلند کرتے ہوئے آئے تھے اور ہم اُجڑے ہوئے چمن کو دیکھنے آئے ہیں۔ وہ دشمن سے دو دو ہاتھ کر رہے تھے اور ہم صرف ہاتھ ملتے ہوئے آرہے ہیں۔ یہ پہاڑ، یہ سرو، یہ ریت اتنے بے حس تو نہیں ہیں کہ دونوں کا فرق محسوس نہ کرتے ہوں۔

اسٹیشن سے ہوٹل میں آگیا۔ میرا قیام HOTEL CESABLANCE ہے۔ یہی نام اپنی دنیا سے زیادہ قریب محسوس ہوا۔ اس لئے انتخاب کر لیا لیکن انتخاب غلط نہ رہا۔ نہ زیادہ مہنگا ہے نہ بہت سستا۔ اوسط ہوٹل ہے لیکن صاف ستھرا ہے۔ یہاں زبان کا مسئلہ بہت پریشان کن ہے انگریزی جاننے والے شاذ شاذ ہیں۔ پھر میرے پاس ڈیڑھ دن ہے، اس لئے کے ذریعہ سفر طے کیا۔ یہاں TOORIST کے لئے الگ بسیں چلتی ہیں۔ گائیڈ بھی ہوتا ہے جو اطالوی، فرنچ، اسپینش اور انگریزی میں کمنٹری کرتا ہے۔ اس لئے میں نے کمپنی سے معاملہ طے کیا اور سفر شروع ہوا۔ سب سے پہلے الحمرا اور نجیر الیف کا پروگرام بنایا۔ ہمارا قافلہ سب سے پہلے خیر اثالائٹ GERANAL IFI پہنچا یہ سلطان کا گرمی کا محل اور باغ ہے اور دراصل تو باغ ہی ہے اس کے ساتھ ایک بارہ دری ہے اور ایک مختصر محل ہے، باغ میں قدم رکھتے ہی آدمی متحیر رہ جاتا ہے۔

ع دیکھ کر میں دیکھتا ہی رہ گیا!

یوروپ کی سرزمین پر اور یہ باغ! یہاں کے لوگ اس معاملہ میں بے حد بد ذوق ہیں۔ یہ باغ کے تصور ہی سے ناآشنا ہیں جنگل کو باغ کا نام دیتے ہیں FRENCH-GARDEN کہتے ہیں۔ یعنی اس میں نہ کوئی ترتیب، نہ کوئی صفائی، نہ سرو بندی نہ تختہ آرائی۔ بس جنگل نما جھاڑ جھنکاڑ کا نام ہے باغ ENGLISH-GARDEN اس سے ذرا بہتر ہوتا ہے یعنی اس میں کچھ کچھ TRAIRING ہوتی ہے لیکن کوئی ترتیب وغیرہ نہیں کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہ مغلوں کے باغوں پر بھی بازی لے جاتا ہے۔ سرو سے اس کا پہلا اور اصل حصہ بنایا گیا ہے۔ اسی کی باڑیں ہیں اسی کی محرابیں ہیں۔ اسی سے کمرے ترتیب دیئے گئے ہیں۔ پورا محل درختوں سے تیار کیا گیا ہے۔ ان کے درمیان فوارے ہیں۔ فرش ہے جس پر انار کھلے ہوئے ہیں۔ فوارے ایک خودکار نظام کے ذریعہ چل رہے ہیں پانی کو ایک خاص بلندی سے لایا گیا ہے کہ اس سے اتنی قوت پیدا ہو جائے کہ وہ فواروں میں ایک خاص بلندی تک رہ نما ہو۔ کوئی POMPING کا نظام نہیں ہے۔ پھر ہر جگہ PRESSURE ہوا ہے تاکہ جہاں پانی کو جتنا اونچا جانا چاہئے اتنا ہی اونچا جائے زیادہ یا کم نہ ہو۔ پانی بالکل ٹھنڈا، فوارے نہایت خوبصورت اور متوازن۔ دنیا جہان کے سارے مناظر وہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں۔ ہر کسی کا دل چاہتا ہے کہ بس یہیں بیٹھا رہے۔ اس سے آگے جاتے ہیں تو ایک مختصر سی نہر اور حوض ہے اور اس پر بارہ دری! پتھر کی اس بارہ دری پر نہایت نازک بیلیں اور نقیس کام ہوا ہے اور ہر طرف لا غالب الا اللہ لکھا ہوا ہے۔ اوپر بھی ایک گیلری اور ہال ہے۔ سونے کے کمرے الگ الگ ہیں۔ اس بارہ دری سے اندر کی طرف دیکھو تو باغ، فوارے اور حوض ہے۔ باہر کی سمت دیکھو تو پورا غرناطہ آنکھوں کے سامنے ہے۔ الحمرا اس سے پون میل کے فاصلے پر ہے۔ لیکن باغ میں باغ ہی کے ذریعہ اس تک جایا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں نے اپنے کلچر کے فروغ میں ان بنیادی تصورات کو سمونے کی کوشش کی ہے جو اسلام نے دیئے۔ جنت کے باغوں کے تصور پر اپنے باغوں کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ درختوں سے حسن، پانی سے برودگی اور لطافت اور پھولوں سے دلآویزی پیدا کی ہے یہاں ایک سکون ہے۔ یوروپ کی پوری زندگی میں ایک

ہیجان اور ہلچل پائی جاتی ہے، لیکن یہاں قدم رکھتے ہی آدمی ایک ٹھنڈک محسوس کرتا ہے۔ اسے قرار سا محسوس ہوتا ہے۔ وہ فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا ہے اس کی روح ایک سرور اور انبساط محسوس کرتی ہے۔ یہ محض میرا نہیں بلکہ بیشتر مسلمانوں کا یہی احساس ہے۔ ہزار سال پہلے تو ہم نے دنیا کو سب ہی کچھ سکھایا تھا لیکن آج بھی ہم انھیں بہت کچھ سکھا سکتے ہیں۔ انھوں نے بنایا تو بہت کچھ ہے لیکن تہذیب و تمدن کے میلان میں یہ بیحد پس ماندہ ہیں اور یہ باغ تو بلاشبہ جنت کے باغوں میں سے ایک معلوم ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہم یہاں ایک گھنٹہ سے زیادہ نہ ٹھیر سکے اور وہاں سے الحمراء کیلئے روانہ ہو گئے۔ حالانکہ اگر آدمی یہاں پوری عمر گذار دے تو بھی یہی محسوس ہو کہ چند لمحے ہی بسر ہوئے ہیں!

الحمراء دراصل قصر الاحمر کی تلخیص ہے۔ چودھویں صدی میں اس کی تعمیر عمل میں آئی تھی۔ پہلے ایک قلعہ ہے جو اس قصر کے لئے پناہ کا کام بھی کرتا تھا۔ اصل محل تین بڑے حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک بڑے دروازے سے ہم داخل ہوتے ہیں جسے غالباً باب العدل کہتے ہیں — اب لوگ اسے GATE OF JUSTICE کہتے ہیں۔ سادہ مگر پُر عظمت۔ پہلا حصہ قصر عدل ہے۔ دوسرا دیوانِ عام و خاص کی نوعیت کا اور تیسرا بادشاہ کا محل اور زنان خانہ۔ ان کے حسن، کام کی نزاکت، عناصر کی ترتیب اور توازن، پانی اور سبزہ کے دلکش استعمال — ان تمام کی تعریف کے نئے الفاظ نہیں ہیں۔ میرا عالم تو عجیب تھا۔ الحمراء میں قدم رکھتے ہی ایک وارفتگی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ جس طرف دیکھتا بس نظر ہٹنا مشکل ہو جاتی۔ اپنی تہذیب کی عظمت کے نقوش لوحِ حافظہ پر ابھرنے لگے۔ پھر تباہی کے مناظر آنکھوں میں گھومنے لگتے۔ دل میں شدید اضطراب اور غصہ، آنکھیں بار بار نم ہو گئیں۔ قصرِ عدل کا خاصا حصہ کمبختوں نے تباہ کر دیا ہے۔ اس میں اپنے INSIGNE بھی آویزاں کر دیئے ہیں۔ لیکن اس طرح کہ مخالف سے مخالف آنکھ کو بھی کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند ہی محسوس ہوں۔ اس کے ساتھ ایک کمرہ عبادت کے لئے ہے۔ یہ محفوظ ہے۔ بڑا نفیس کام ہے اس پر۔ ایک محراب قبلہ رو ہے جہاں امام کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس مقام پر میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ آنسو چہرے پر گرنے لگے۔ آہستہ آہستہ اذان دی۔ دوسرے لوگ متحیر ہو کر دیکھنے لگے شاید جنونی سمجھ رہے ہوں۔ لیکن کاش ہم جنونی ہوتے۔ دنیا میں بڑے کام انھیں نے کئے ہیں جنھیں دنیا جنونی کہتی ہے۔ اگر ہمارا جنون سرد نہ پڑ جاتا تو آج اندلس غیروں کے پاس نہ ہوتا۔ اصل ایوان سلطنت اگلے محل میں ہے اس کا حسن لاثانی ہے۔ بیچ میں نہر ہے۔ فوارے ہیں، پھر بڑا ہال ہے، یہاں معاملات حکومت طے ہوا کرتے تھے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں غرناطہ کو اسبیلہ کے سپرد کرنے کا فیصلہ ہوا تھا اور مسلمانوں نے خود شہر کی چابیاں ظالموں کو دے دی تھیں۔ یہاں کے گائیڈ بھی بے حد متعصب ہیں میری قدم قدم پر اس سے جھڑپیں ہوئیں۔ کیا کروں ان باتوں پر صبر ممکن ہی نہ تھا۔ عربوں کو INVADER کہنا، برا بھلا کہنا حرم کا مذاق اڑانا، شکست کو بار بار دہرانا اور ان آثار کے باقی رکھنے کو اپنی رواداری قرار دینا ان کا شیوہ ہے۔ میں نے کہا کہ ذرا یہ بتاؤ گے کہ عیسائی جو یہاں آئے وہ یہیں کے بسنے والے تھے یا روم سے آئے تھے؟ کیا یہاں کے لوگ اسلام نہ لے آئے تھے اور پھر جن ۳ لاکھ کو یا ان سے بھی زیادہ افراد نہ تم نے یہاں سے نکالا وہ سب عرب تھے؟ کیا ہر مسلمان کیساتھ یہی سلوک نہیں ہوا؟ کیا اس کا نام رواداری ہے کہ تم نے ان سے جینے کا حق تک چھین لیا جو تمہارا مذہب قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔

ہمارا گائیڈ ایک سابق پروفیسر مائیکل تھا۔ جب قصر عدالت کے دروازے پر آئے تو اس سے دلچسپ جھڑپ ہی بڑے دروازے پر ایک ہاتھ بنا ہوا ہے اور ایک چھوٹے دروازے پر ایک چابی بنی ہے۔ وہ کہنے لگا کہ ہاتھ مسلمانوں کے ۵ افراد کی نمائندگی کرتا ہے۔ الگ الگ انگلیاں اس کی علامت ہیں اور چابی سے مراد یہ ہے کہ جب یہ ہاتھ اس چابی کو اپنی گرفت

میں لے لے گا تو الحمرا دوبارہ مسلمانوں کے قبضہ میں آجائے گا۔ کہنے لگا "اگر یہ ہاتھ دوبارہ نیچے آیا تو میں اسے توڑ ڈالوں گا!" میں نے کہا "لیکن اگر دوبارہ آئے تو وہ ایک ہزار اور الحمرا ہمارا ہے ۵۰ سال میں تم الحمرا کا دسواں حصہ بھی نہیں بنا سکے ہو تمہیں تو ان کا شکر گزار ہونا چاہیئے اور انھیں خوش آمدید کہنا چاہیئے!" خاموش ہو گیا۔ شام کو ہم ان کا CHORCH اور CATHEDRAL دیکھنے گئے، وہاں ROYAL CHURCH میں بالکل شروع ہی میں ایک تصویر لگی ہوئی ہے جس میں مسلمان سلطان عیسائی حکمراں بلکہ اسابیلا کو شہر کی چابیاں دے رہا ہے اسے CONQUEST OF GRANADA کہا گیا۔ اس تصویر کو خاص طور پر دکھایا جاتا ہے۔ اسابیلا کی شجاعت کی تعریفیں مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے پوچھا کہ کیا تم نے غرناطہ کو قوتِ بازو سے فتح کیا تھا؟ بہت جھنجھلایا۔ ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں، اور ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ شاید ہم دونوں ہی چشم تخیل میں یہ دیکھ رہے تھے کہ اسابیلا برسوں کی تیاری کے باوجود غرناطہ پر حملہ کی ہمت نہ کرتی تھی۔ البتہ اس کے جاسوس مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے میں مصروف رہے۔ بالآخر سلطان اور اس کے لڑکے میں تخت کے لئے جنگ شروع ہو گئی اور ہماری تلواریں ایک دوسرے کو کاٹنے میں لگ گئیں۔ اس وقت اسابیلہ نے شہر کا محاصرہ کیا اور پانی کاٹ دیا۔ اب بھی مسلمان ہتھیار ڈالنے کو تیار نہ تھے لیکن منافق سرداروں نے اسابیلا کے جاسوسوں کے اشاروں پر سلطان سے کہا کہ آپ اپنے اور خاندان کے لئے تحفظات لے لیجئے اور لڑائی نہ کیجئے۔ اسطرح غرناطہ "فتح" ہوا۔ چالاکی اور عیاری کے ذریعے نہ کہ نوکِ شمشیر سے! میں نے خاموشی کے ان لمحات کا سکوت کیوں توڑا۔ O GRANTED WAS NIT CONQOTRCD IN BATTLE اور اسے کہنا پڑا ہاں میں بعد میں جان جان کر ایک ایک جگہ کے بارے میں پوچھتا رہا کہ "یہاں پہلے کیا تھا؟" اور اسے بتانا پڑتا کہ مسجد تھی لائبریری تھی، یونیورسٹی تھی ــ اس طرح اپنی رواداری کا اعتراف سب کے سامنے اسے بار بار کرنا پڑتا۔ وہ زچ ہو گیا تھا اور آخر میں ایک جگہ کے بعد خود ہی کہنے لگا۔

THIS IS A MONASTRY AND THERE WAS NO MOSQUE BEFORE

پہلے ہی دن سارا دن صرف کر کے میں نے تمام اہم مقامات دیکھ لئے تھے۔ رات کو تمہارے لئے یہ سب کچھ لکھ کر دل کا بخار ہلکا کر لیا تھا مگر طبیعت اتنی متاثر تھی کہ پورا لطف نہ لے سکا۔ آج پھر صبح ہی بلا گائیڈ کے الحمرا چلا گیا اور ۵ گھنٹے وہیں سرگرداں رہا۔ جس کی حالت یہ تھی کہ:-

درودیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں!

الحمرا حسنِ مجسم ہے۔ سنگِ مرمر میں ایک مرصع غزل۔ اس کا کام اتنا نازک ہے کہ کہیں اس کی مثال نہیں ملتی۔ تاج محل خود ایک بے نظیر چیز ہے لیکن اس کے ARCHITECT میں اور اس میں بڑا فرق ہے۔ یہاں کام اتنا نازک، نفیس اور باریک ہے کہ آدمی ورطۂ حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ افسوس کہ اس کا بھی ایک بڑا حصہ تباہ ہو چکا ہے اور اس میں ایک چیز کے علاوہ کوئی دوسرا نشان ہماری تہذیب کا نظر نہیں آتا۔ الحمرا میں ایک بھی تصویر یا بت یا جاندار کی شبیہ نہیں ہے (مسلمانوں کے عہد میں۔ اب عیسائیوں نے کچھ اضافے کر دیئے ہیں) لیکن حسن ایسا کہ آنکھ ٹھیر نہیں پاتی۔ اور یہ حالت ہے ۶۰۰ سال بعد! اور بار بار کی تباہی کے علی الرغم۔ آج دل بھر کر دیکھا اور بار بار دیکھا ڈھائی بجے واپس آیا اور ساڑھے تین بجے اشبیلیہ کیلئے بذریعہ بس روانہ ہوا۔ راستے میں بھی بہت سے نشانات ماضی کے نظر آئے۔ اب اس خط کو تمہیں بھیج رہا ہوں اور اگلی منزل قرطبہ ہے۔

ہائے قرطبہ!!

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا

وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں

(اقبالؒ)

حاشیوں پر حاشیے

مولانا عبدالماجد دریابادی کے کیا کہنے۔ وہ اپنے طرز تحریر کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی۔ ان کے صدقِ جدید کا فائل بس یونہی الٹ پلٹ رہا تھا کہ دو شذروں پر قلم بس بے اختیار حرکت میں آگیا۔ پیوند چاہے مخمل میں ٹاٹ کا ہو مگر اپنی حماقت سے لگ ہی گیا ہے تو پھر آپ بھی دیکھنے سے کیوں چوکیں۔

(ملّا ابن العرب مکّی)

جھوٹ کا طومار

لوک سبھا میں وزیر قانون مسٹر گونداخن کا بیان ایک سوال کے جواب میں:-

مسلم آبادی میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زائد نہیں کچھ کم ہی ہے۔ یعنی فی ہزار مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا تناسب ۹۳۰ کا ہے۔

اب کوئی صاحب فہم و دانش ذرا بتائیں کہ مسلمان مرد اگر تعدد ازواج کے شوق کو پورا کرنا چاہیں بھی تو آخر یہ ممکن کیونکر ہے؟ اور اس تناسب آبادی کے بعد اس کی عملی صورت ہو، کیا ہو سکتی ہے؟

ایک طرف یہ ٹھوس اعداد رکھیے اور دوسری طرف آریہ سماجیوں، جن سنگھیوں اور وقت کے مدھوکوں اور گوالکروں کے وہ بیان پڑھیے جو ہر طرف سے اُبلے پڑتے ہیں اور جن سے صاف یہ نکلتا ہے کہ تعدد ازواج کا رواج مسلمانوں میں خواص سے عوام تک اور اوپر سے نیچے تک پھیلا ہوا ہے۔ خود ہر مسلمان مرد اگر چار چار نہیں تو تین تین یا دو دو بیبیوں کو رکھے ہوئے ہے۔

رنگین جھوٹ اس کو کہیں یا سفید جھوٹ؟.....

(ملّا کہتا ہے) اے مولانائے محترم! — آپ وقت کے مدھوکوں اور گوالکروں پر تو برابر التفات فرما رہے ہیں لیکن گوشۂ چشم ذرا شاہی جامع مسجد دہلی کے نائب امام سیّد عبداللہ بخاری کی طرف بھی تو پھیرنے کی تکلیف کیجئے ان کا جو فتویٰ (؟) چھوٹی سے (فتوہ) سفید کاغذ پر ٹائپ کے حروف میں ضبطِ تولید کے نہ صرف جواز بلکہ استحسان میں غالباً پچاس ہزار کی تعداد میں شائع ہوا ہے، کیا اسے بھی آپ نے دیکھا —

اللہ اکبر۔ اتنا کرارا اور طرحدار فتویٰ کم ہی کسی مفتی کو لکھنا نصیب ہوا ہوگا۔ استدلال، لب و لہجہ، اسلوب، دروبست ہر چیز اعلیٰ سے اعلیٰ تر۔ پڑھیے اور عش عش کیجئے۔

(صدق جدید - ۵ جنوری ۶۸ء)

آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ سید صاحب جاہل ہیں۔ سید تو کبھی جاہل ہوا ہی نہیں۔ عاجز کے پڑوس میں مرزا تمنا رہتے ہیں۔ پہلے وہ نرے جاہل تھے لیکن پچھلے سال انھوں نے ایک نیا شجرۂ نسب تلاش کر کے اعلان کیا کہ وہ سید ہیں۔ بس پھر اسی دن سے ان کی گفتگو سنیئے۔ علم و دانش کے فقرے جل اٹھتے ہیں۔ لوگ حیرت میں رہ گئے کہ یہ پل کے پل میں کایا کیسی پلٹ ہوئی۔ موصوف نے فرمایا کہ آدمی جس دن سید بنتا ہے اسی دن سے اس کی رگ رگ میں علم و دانش کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہے۔

تو سید عبداللہ بخاری کا صاحب علم و دانش ہونا تو دلیل قطعی سے ثابت ہوا۔ پھر ان کا علم صرف ہندوستانی تک محدود نہیں۔ وہ انگریزی کے بھی گریجویٹ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کا روشن ثبوت ان کے فتوے کی یہ زرّیں عبارت ہے کہ :-

"رہی آبادکاری تو اس کے لئے زمین تو امپورٹ نہیں کی جا سکتی ـــ"

درآمد کے بجائے "امپورٹ" کا جلیل القدر لفظ استعمال کرنے کی مجال کیا کسی ایسے ملائے خشک کو ہو سکتی ہے جس نے انگریزی کو کھنگال کر نہ رکھ دیا ہو۔ اس سے ایک یہ بھی فائدہ ہوا کہ فتویٰ صرف ہندوستانی نہیں رہا، انگلو انڈین ہو گیا۔

آپ حیران ہوں گے کہ ضبط تولید کے فتوے میں زمین کی امپورٹ اور ایکسپورٹ کا دھندہ کہاں سے نکل آیا ـــ تو یہ بھی جناب مفتی کا کمال فن سمجھئے۔ وہ سمجھا ہم گدھوں کو ـــ یعنی تمام مسلمانوں کو یہ رہے ہیں کہ نالائقو اور بدعقلو! تم جس تیز رفتاری سے بچے پیدا کر رہے ہو اس کا تو نتیجہ لازماً ایک دن یہ ہوگا کہ بچے زیادہ اور زمین کم۔ اب زمین تو ایسی چیز ہے نہیں جو تم گیہوں اور چنے کی طرح باہر سے منگا لو لہٰذا واحد راستہ عافیت کا یہ ہے کہ بچوں کی چیں پٹاخ سے باز آجاؤ ورنہ انجام یہ ہوگا کہ ملک کی زمین کم ہونے کی وجہ سے فاضل بچوں کو ہوا میں پالنا ہوگا۔ اور اے محترم مدیر صدق! ابھی مولانا فنا فی اللہ بھی میدان میں آنے والے ہیں۔ پھر شاید العظمت للہ آئیں گے۔ یہ سب اپنے اپنے فتوے پکا رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ ان کے شجرہ ہائے نسب بھی ترتیب و تسوید کے مراحل سے گزر رہے ہوں تو تعجب نہیں۔ آپ اگر مدھو کوں اور گوالکروں ہی پر ساری توجہات صرف کرتے رہے اور یہ قوم پرور مولانا (معاف کیجئے گا مولانا کی جمع اور کچھ سمجھ میں نہیں آئی) بے روک ٹوک بچہ روک مشن کی تبلیغ کا پرچم لہراتے رہے تو آپ ہی جیسے علم و فضل والوں سے اللہ کے گھر یہ سوال کیا جائیگا کہ کیا تمھارے پاس یہ حدیث نہیں پہنچی تھی :-

"زیادہ محبت کرنے والی اور زیادہ اولاد پیدا کرنے والی عورتوں سے شادی کرو۔ میں اپنی امت کی تعداد دوسری امتوں سے زیادہ دیکھنا چاہتا ہوں ـــ"

تو پھر کیا آپ یہ جواب دے سکیں گے کہ سید عبداللہ بخاری جیسے ارسطو صفت مفتیوں نے چوں کہ حساب لگا کر یہ بتایا تھا کہ بچے پیدا کرنے بند کر دو ورنہ زمین کم اور بچے زیادہ ہو جائیں گے اس لئے ہم نے بچہ روک مشن پر نے دے کر نامناسب نہیں سمجھا۔ اور اگر اللہ نے ارضُ اللہِ واسعۃٌ والی آیت یاد دلائی تو کیا آپ یہ کہہ سکیں گے کہ بندے نے تفسیر تو لکھی مگر اس آیت کا سراغ نہ لگ سکا۔

تین رسوائیاں

انگریزی کے معروف اہل قلم سی نراد چودھری جو علاوہ ایک زبردست اہل قلم کے بیرونی ملکوں کی سیاحی کا بھی تجربہ خوب رکھتے ہیں۔ ان کے اندازے میں ہندوستان کی شبیہہ بیرونی دنیا میں (اسٹیٹسمین ۱۹ر نومبر ۸۳ء)

اس ۲۰ برس کے اندر تین صدمے ہندوستان

کی شہرت کو ایسے پہنچے جنھوں نے اس کا وقار ہی باہر کے ملکوں میں مجروح کر کے رکھ دیا۔ ان میں سے پہلا واقعہ تو ہماری تسخیر گوآ ہے۔ ہندوستان کی بچی کھچی شہرت امن پسندی و صلح و دوستی کی اور اس کی اخلاقی وقعت خاک میں ملا دی ہندوستان کو قبضہ کر لینے کا حق تو بے شک تھا۔ لیکن کیا یہ سیاسی حیثیت سے بھی مناسب و قرین مصلحت تھا؟

دوسرا حادثہ ۱۹۶۲ء میں چینی جارحیت کا ہے۔ ہندوستان کی جنگی قوت و قابلیت کا رعب اس نے بالکل ختم کر ڈالا۔ اس کے قبل سب کو یقین تھا کہ ہندوستان چین کے مقابلے میں کچھ تو ٹکے گا۔ افرا ایشیائی بلاک نے اس کے بعد ہندوستان سے قطع نظر کر لی۔

ہندوستان کی بدراہی کی تیسری منزل ۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ ہے۔ توقع یہ تھی کہ تین ہفتہ کا موقع جو ملا اتنی مدت میں ہندوستان پاکستان کی جنگی طاقت کو تہس نہس کر دے گا۔ جیسا کہ اسرائیل نے کل تین دن میں کر کے دکھا دیا۔ اس نے دنیا کو یہ دکھا دیا کہ ہندوستان میں جارحیت بغیر نفع جارحیت کے ہے۔

نراد چودھری ملک کے ان دانشوروں میں ہیں جو ملک کے بڑے انگریزی روزناموں کے ایڈیٹروں کی طرح ملک کی اصلی دوستی اور خیر خواہی اس کی سو فی صدی مداحی اور خوشامد میں نہیں بلکہ مناسب نکتہ چینی میں بھی سمجھتے ہیں اور ان کی کتابیں اور کلکتہ کے ہفتہ وار NOW میں ان کے مضمون و مقالے بڑے غور و توجہ سے پڑھے جاتے ہیں۔ (صدق جدید۔ ۵ر جنوری ۶۸ء)

(ملا کہتا ہے) نراد چودھری کیسے بھی دانشور ہوں ایسی عجیب بات کا یقین کوئی کیسے کر لے کہ ۶۵ء کی ہند و پاک جنگ نے پاکستان کی جنگی طاقت کو تہس نہس کر کے نہیں رکھ دیا۔ دنیا نے تو جنگ کے زمانے میں آکاشوانی سے یہی سنا تھا کہ ہماری فوج ظفر موج روز ہی پاکستان کے اتنے ٹینک اور ہوائی جہاز تباہ کر رہی ہے کہ اگر جنگ کی مجموعی مدت پر انھیں پھیلا دیا جائے تو پاکستان کے نہ صرف موجودہ ٹینک اور ہوائی جہاز ختم ہو جاتے ہیں بلکہ کچھ مقدار اس ذخیرے کی بھی پیشگی ہی غارت ہو جاتی ہے جو اس نے جنگ کے بعد جمع کیا ہوگا۔

پھر عجیب سے عجیب تر بات تو نراد چودھری نے یہ کہدی کہ "ہندوستان میں جارحیت بغیر نفع جارحیت کے ہے۔"

کیا مطلب؟ ــــ کیا نراد چودھری یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ سن پینسٹھ کی ہند و پاک جنگ میں جارح پاکستان نہیں تھا ہندوستان تھا ــــ استغفر اللہ۔ ہزار بار خدا کی پناہ۔ جارح کا ترجمہ اگر حملہ آور ہوتا ہے تو کون سچا اور پکا ہندوستانی مان لے گا کہ اس جنگ میں حملے کی پہل اُس مقدس دیس نے کی تھی جس کی نس نس میں اہنسا، پیار، شانتی اور نیائے کا خون موجیں مار رہا ہے۔ بھگوان سے ڈریئے۔ ہمارے ریڈیو، ہمارے اخبارات، ہمارے لیڈر، ہمارے حکام سب تو پوری تحقیق کے بعد نہایت وثوق سے ہمیں یہ بتاتے رہے ہیں کہ حملہ آور پاکستان تھا۔ جارحیت کا مرتکب وہی ہوا۔ خود اس پر نراد چودھری یہ طنز اُلٹ دیں تو بجا ہوگا کہ جارحیت اس کی نفع جارحیت سے محروم رہی۔ ہندوستان تو مدافع تھا۔ مظلوم تھا۔ دفاع کا نفع اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ حملہ آور کو اس کے مطلوبہ علاقے پر قبضہ کرنے نہیں دیا گیا۔ اس نفع سے پھر ہمارا ہندوستان محروم کیوں رہا۔ کشمیر کل کی طرح آج بھی ہمارا ہے اور نراد چودھری جیسے دانشور آج بھی ان نااہلوں کی فہرست میں شامل ہیں جنھیں وزارت تو کیا تھانیداری بھی نصیب نہیں ہو سکتی۔ زندہ باد ہندوستان۔

(ایشیا - ۷ جنوری)

شیخ حسن البنا شہیدؒ کی ڈائری کا ایک ورق

پہلی ربیع الاول سے بارہ ربیع الاول تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کی یاد میں جلوس نکالنے کا ہمارا دل تھا۔ جلوس کسی متعین جگہ سے نکلنے کے بجائے باری باری کسی نہ کسی ساتھی کے گھر سے نکلا کرتا تھا۔ ایک رات شیخ شبلی کے یہاں کی باری تھی۔ حسب معمول عشاء بعد ہم لوگ ان کے گھر پہنچے۔ دیکھا کہ گھر صاف ستھرا اور روشن ہے۔

دستور کے مطابق قہوہ اور دوسرے مشروبات کا دور چلا اس کے بعد انتہائی خوشی اور مسرت کے ساتھ وہ قصائد پڑھے گئے جن کو عام طور پر پڑھا جاتا تھا۔ جلوس سے واپسی میں تھوڑی دیر شیخ شبلی کے یہاں ہم لوگ ٹھہرے۔ جب وہاں سے ہم لوگ چلنے لگے تو ایک لطیف اور ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا۔

"صبح آپ لوگ آجایئے گا — روحیہ کی تدفین کرنی ہے"

روحیہ ان کی اکلوتی لڑکی تھی۔ شادی کے نو سال بعد ولادت ہوئی تھی۔ شیخ کو اس سے اس قدر محبت تھی کہ اپنے کام میں بھی اس کو اپنے سے جدا کرنا پسند نہ فرماتے تھے۔ اسی عالم میں وہ پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ اس کا نام روحیہ اس لئے رکھا تھا کہ وہ ان کیلئے بمنزلہ روح کے تھی ہمیں یہ سنکر بڑا تعجب ہوا۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ کب وفات ہوئی؟ فرمایا۔

"مغرب سے ذرا پہلے۔"

"آپ نے ہمیں کیوں نہیں بتایا؟" ہم نے دوبارہ سوال کیا "کسی اور گھر سے جلوس نکالتے۔"

انھوں نے فرمایا کیا ہو گیا؟ اس طرح ہمارا غم ہلکا ہو گیا اور مجلس غم خوشی و مسرت تبدیل ہو گئی۔ کیا آپ لوگ اس کو اللہ کی طرف سے معمولی نعمت سمجھتے ہیں۔"

پھر بات درس تصوف کی چل پڑی اور درس خود شیخ شبلی دے رہے تھے۔ فرمانے لگے:۔ کہ ان کی لڑکی کی وفات اس لئے ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کو ان کے قلب پر غیرت آگئی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے نیک بندوں کے دلوں پر اس وقت غیرت آتی ہے جب ان کا دل اللہ کے علاوہ کسی اور سے لگ جاتا ہے۔

دعوائے محبت۔ حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ کی مثال

دیتے ہوئے فرمایا کہ ان کا دل اسمٰعیل علیہ السلام سے لگ گیا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح کا حکم دیا اسی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام کا دل جب یوسف علیہ السلام میں لگ گیا تو اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کو ان سے چند سالوں کے لئے جدا کر دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے کا دل اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور سے نہیں لگنا چاہیئے ورنہ وہ دعوائے محبت میں جھوٹا ہوگا۔ اس سلسلے میں فضیل بن عیاض کا قصہ بیان کیا کہ وہ اپنی بچی کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے اتنے میں اس کا بوسہ لے لیا۔ اس پر بچی نے ان سے پوچھا۔

"ابا جان! کیا آپ کو مجھ سے محبت ہے؟"

انھوں نے کہا۔

"ہاں پیاری بیٹی"

لڑکی نے کہا۔ بخدا، آج سے پہلے میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتی تھی، انھوں نے کہا یہ کیسے، کتنی بار میں نے جھوٹ بولا۔ لڑکی نے کہا میرا خیال ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے اپنے تعلق کی حالت میں کسی اور سے محبت نہیں کر سکتے۔ اتنا کہنا تھا کہ وہ رو پڑے اور کہا! میرے آقا تیرے بندے فضیل کی ریاکاری کا راز بچوں تک پر کھل گیا۔ یہ اور اسی جیسی باتوں سے شیخ شبلی ہمارے غم کو ہلکا کرتے رہے اور ان کے غم اور دکھ سے ہمیں جو تکلیف پہنچی تھی اس کا ازالہ کرتے رہے ہم نے محسوس کیا کہ ان کے یہاں رات بسر کرنے میں ان کو تکلیف اور جھجک معلوم ہو رہی ہے ہم لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے اور پھر صبح ان کے یہاں گئے۔ روحیہ کی تدفین کی۔ ہمیں نہ کسی رونے والے کی آواز اور نہ بین کرنے والی کی چیخ و پکار سنائی دی۔ وہاں ہمیں صرف صبر کے مظاہرے اور رضائے الٰہی کے نمونے ہی نظر آئے۔

اسی طرح ایک مرتبہ ہمارے استاذ شیخ محمد زہران کی کسی بچی کی وفات ہو گئی تھی۔ انھوں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور برابر تین دنوں تک وعظ و نصیحت کا درس دیتے رہے اور مجلس ماتم کے سلسلے میں جو منکرات رائج تھے۔ ان کا مقابلہ کرتے رہے اور اس غمی کے موقعہ پر انھوں نے ان جاہلی رسوم و بدعات کو مٹانے کا بھی فائدہ اٹھایا جو آج تک لوگوں میں رائج ہیں اور جن کی کوئی اصل نہیں۔

قاہرہ کی حالت زار

جس وقت قاہرہ لوٹا اس وقت یہاں اسلامی انجمنوں کی کثرت نہیں تھی جتنی اب ہے وہاں اس وقت صرف ایک انجمن جمعیت مکارم اخلاق اسلامیہ نام کی تھی۔ جس کے امیر شیخ محمود تھے اس انجمن کے تحت اس کے مرکز "مرکز دار السادات برکۃ فیل" میں اسلامیات کے موضوع پر ہر ہفتے تقریریں ہوا کرتی تھیں اور جگہ اپنی وسعت اور پھیلاؤ کے باوجود زائرین سے بھری رہتی تھی تقریریں زیادہ تر علمی اور مفید موضوعات پر ہوتی تھیں۔ شیخ عباس (انجمن مکارم کے قاری) کی آواز اتنی پرکشش اور مؤثر تھی کہ سننے والوں کے دل بے اختیار اس کی طرف کھنچ جاتے تھے۔ جب تک میرا قیام قاہرہ میں رہا اس انجمن کے جلسوں میں پابندی سے ایک ممبر کی طرح شریک ہوتا رہا۔

قاہرہ میں اکثر جگہوں پر جو اخلاقی گراوٹ اور عوام کی دین کے احکام سے ناواقفیت اور اخبارات اور رسائل میں اسلامی تعلیمات کے منافی چیزوں کو دیکھا تو اس سے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ تنہا مسجدیں لوگوں تک اسلامی تعلیمات پہنچانے کے لئے کافی نہیں ہیں۔ مسجدوں میں چند ایسے با اثر فاضل علماء ضرور تھے جو برابر وعظ و نصیحت کیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر عبد الخولی رح شیخ علی محفوظ رح شیخ محمد العدوی منتقش الوعظ والارشاد تھے ان کا لوگوں پر کافی اثر تھا۔ اور وہ خالصتاً للہ یہ کام کیا کرتے تھے۔ ان سب کو دیکھ کر میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ ازہر اور دار العلوم کے طلباء کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے تاکہ وہ مسجدوں اور قہوہ خانوں اور دوسری اسلامی سوسائٹی میں وعظ اور ارشاد کی مشق کریں اور ان میں ایک جماعت ایسی ہو جو دیہاتوں اور اہم شہروں کے باہری علاقوں میں تبلیغ دین کا کام کر سکیں۔ چنانچہ میں نے اپنے خیال کو عملی جامہ پہنایا اور چند دوستوں کو اس اہم پروگرام میں شرکت کی دعوت بھی دیدی۔ ان میں سے استاذ محمد کور تھے جو ازہر کے فاضل ہیں اور شیخ حامد عسکری رح اور اخوان المسلمین

کی مجلس تاسیسی کے ممبر شیخ احمد عبد الحمید وغیرہم تھے ہم لوگ صفلیہ میں مسجد خنجون کے طلبہ کے کمروں میں جمع ہوتے تھے۔ اور اس کام کی اہمیت اور اس کی ذمہ داری کا تذکرہ کرتے تھے اور علمی و عملی تیاری کی ضرورت پر گفتگو کرتے۔ اس کام کے لئے میں نے کچھ کتابوں کو منتخب کیا تھا۔ جیسے امام غزالیؒ کی کتاب الاحیاء نبہانی کی انوار محمدیہ، شیخ کردری کی تنویر القلوب فی معاملۃ علام الغیوب اور سیرت اور اخلاق کی بعض دوسری کتابیں تاکہ یہ ان ساتھیوں کے لئے چلتا پھرتا ایک مکتبہ بن جائے۔

عاریتاً لے کر پڑھیں اور اس سے مواعظ اور تقریروں کی تیاری کریں۔

قہوہ خانوں میں تبلیغ

اس علمی تیاری کے بعد عملی اقدام کی باری تھی۔

میں نے ان حضرات کے سامنے قہوہ خانوں میں وعظ و نصیحت کی بات رکھی اس پر ان حضرات کو بڑی حیرت اور تعجب ہوا اور کہا کہ قہوہ خانے والے اجازت دینے کے بجائے اس پر اعتراض کریں گے۔ اس لئے کہ ان کے کاموں میں خلل ہوگا اور قہوہ خانے میں بیٹھے ہوئے لوگوں پر وعظ و نصیحت سے زیادہ گراں کوئی چیز نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ اس سے ان کی دلچسپیوں اور تفریحات میں کمی آئے گی۔ اور پھر ہم کیسے ان لوگوں کے سامنے دین و اخلاق کے خشک موضوع کو رکھیں گے جبکہ ان کے سامنے تفریحات اور دلچسپی کی چیزوں کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچنے کی ذرہ برابر گنجائش نہیں۔

مجھے ان کے اس نظریہ سے اختلاف تھا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ قہوہ خانوں میں جو لوگ آتے ہیں اور وہاں بیٹھتے ہیں وہ وعظ و نصیحت کی باتوں کو سننے کے لئے اور لوگوں کی بہ نسبت حتیٰ کہ مسجدوں میں رہنے والوں سے زیادہ تیار رہیں گے۔ اور ان سے زیادہ دلچسپی سے سنیں گے۔ کیونکہ ان کے لئے یہ چیز نئی بھی ہوگی اور دلچسپ بھی البتہ اس کے لئے موضوع کے اچھے انتخاب کا لحاظ کرنا ہوگا۔ ان سے ایسی چیزوں سے تعرض نہیں کریں گے جو ان کے احساس کو مجروح کر دے بلکہ ان کے سامنے اپنی باتیں دلکش اور اچھے انداز میں رکھیں گے اور طویل گفتگو سے احتراز کریں گے۔ اس موضوع پر ہماری بحث طویل ہوگئی بالآخر ان حضرات سے میں نے کہا کہ تجربہ ہی کیوں نہ کرلیں۔ سب نے اس کو قبول کیا اور میدان صلاح الدین میں واقع قہوہ خانوں کی طرف نکل پڑے۔ سب سے پہلے سیدہ عائشہ گئے۔ یہاں تک کہ پہاڑی راستہ سے شارع سلام اور سیدہ زینب پہنچے میرا اندازہ ہے کہ اس رات بیس سے زائد تقریریں کیں لیکن ہر تقریر پانچ دس منٹ کے اندر ہی تھی سامعین کا احساس عجیب تھا وہ بہت غور سے ہماری باتیں سنتے تھے۔ قہوہ خانے والے شروع میں تعجب سے دیکھتے تھے پھر مزید کا مطالبہ کرتے تھے۔ اور جب تقریریں ختم ہو جاتیں تو ہم سے قسمیں کھا کے کہتے کہ چائے پیجئے یا ناشتہ کر لیجئے۔ لیکن ہم ان سے تنگی وقت کا عذر کر دیتے اور یہ کہتے کہ ہم نے اس وقت کو اللہ تعالیٰ کی نذر کر دیا ہے۔ اسے کسی اور چیز میں ضائع کرنا نہیں چاہتے اس سے ان پر اور اثر ہوتا۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ اس لئے کہ اللہ نے جس نبی یا رسول کو بھیجا اس کا یہی طریقہ تھا۔ ہم تم سے اس پر کسی اجر کا مطالبہ نہیں کرتے۔ کیونکہ اس سے لوگوں کے دلوں پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ یہ تجربہ سو فیصدی کامیاب رہا۔ قہوہ خانوں سے قیامگاہ واپس آئے یہ کامیابی بڑی عظیم تھی اور اب ہم نے اسی طریقہ کو اپنانے کا ارادہ کر لیا۔ (ایشیا۔ لاہور)

ایک اشاعت خاص

تحریک اسلامی کی زندگی کا وہ ایک لمحہ جب مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے لئے سزائے موت کے فیصلے کا اعلان ہوا۔

ہفت روزہ "آئین" لاہور نے تحریک اسلامی کی زندگی کے اس اہم موڑ کی دستاویز تیار کی ہے۔ یہ تحریک ہی نہیں اس کی دعوت کی دستاویز بھی ہے۔

منیجر۔ ہفت روزہ آئین۔ نسیم مارکیٹ ۲۱ ریلوے روڈ لاہور

مستقل عنوان

ملا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

مولانا مودودی کی چوری

دیکھنے میں یہ بالکل سیدھا سادا عنوان ہے۔ خالص اُردو۔ لیکن آپ دماغ پر زور ڈالیں تو آسانی سے میرے اس دعوے کی تائید کر سکیں گے کہ کوئی بڑے سے بڑا علامہ بھی اس کا کوئی متعین مفہوم اخذ نہیں کر سکتا۔

میرے دعوے کے پیچھے ایک کہانی ہے۔ کہانی کیا یوں کہیئے چند بے ربط واقعات۔ جس وقت یہ عنوان میں نے سپرد قلم کیا میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ یہ اتنا پیچ دار ثابت ہوگا۔ جمعرات کا مبارک دن تھا۔ میرے سامنے نئی رسالے اور اخبار مواد کے طور پر بکھرے ہوئے تھے۔ انکی مناسبت سے میں نے بغیر کسی تامل کے یہ عنوان جمایا۔

"مولانا مودودی کی چوری"

ٹھیک اسی وقت تیز ہوا کا ایک جھونکا درگاہ جنگل بانس کی طرف سے نقاروں کی دل کش آواز لیئے میرے کانوں کے قریب سے گذرا اور میرے خیالات کی رَو مضمون سے ہٹکر اس رنگین زمانے کی طرف چلی گئی جب اجمیر و کلیر وغیرہ کے عرسوں میں تصوف کے گہرے مسائل پر زنانِ عاشقانِ اولیاء سے گاڑھی چھنا کرتی تھی۔ عجیب تھا وہ زمانہ۔ کیف ہی کیف مستی ہی مستی۔

پانی بھی تھا شراب، ہوا بھی شراب تھی

مگر پھر نہ جانے کس قطبِ دوراں کے تصرف نے روحانیت کی تمام جمالیاتی قدروں کا رُخ سینما اور ریڈیو کی طرف ایسا پھیر دیا کہ اب تو نہ زنانِ عاشقانِ اولیا کی صورتیں ہی دل کو بھاتی ہیں نہ ان کی آوازیں ہی کانوں میں رس گھولتی ہیں۔ خیال کے جن طاقچوں میں نذیرن بائی اور بیگم تمیزن وغیرہ سولہ سنگھار کر کے بیٹھا کرتی تھیں اب وہاں فلمی پریاں ڈیرہ جمائے ہوئے ہیں۔ سماعت کے جو دریچے بھوندو قوال اور جھنجھنا بائی کے نغموں سے کھلا کرتے تھے اب ان میں تالے پڑ گئے ہیں اور ان کی کنجیاں محمد رفیع اور لتا منگیشکر جیسے گلوکاروں کے پاس پہنچ گئیں۔

نقاروں کی آواز ابھی کانوں کے کوکر میں پھڑ پھڑا ہی رہی تھی کہ پڑوسی کے ریڈیو سے فلمی نغمہ بلند ہوا۔

ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر کہ دل ابھی بھرا نہیں

میں نے کاغذ سے نظریں ہٹا کر ملائن کی طرف دیکھا جو سنگھار میز کے آئینے میں بال سنوار رہی تھی۔

"سُنا تم نے بھاگوان ـــــ ابھی نہ جاؤ چھوڑ کر۔۔۔"

مصرعہ پورا کرنے کے بجائے میں نے ایک اونچی آہ کھینچی اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ برائے نام سا مسکرائی پھر جواب دیئے بغیر منھ پھیر لیا۔

قصہ دراصل یہ تھا کہ وہ آج تشریف لے جا رہی تھی، اور میں کوشش کر رہا تھا کہ نہ جائے۔ کہاں تشریف لیجا رہی تھی

اس کا جواب مجھ سے نہیں بنے گا۔ آپ خالہ امتل کی زبانی سنیئے ان کا نام تو غالباً امت الرحمان ہے مگر یاد کی جاتی ہیں امتل کے نام سے۔ صرف میری خالہ نہیں بلکہ جگت خالہ ہیں۔ کل آئی تھیں ملائن کو حکم دیا کہ صبح مولانا بدرالدین کے یہاں ہو آنا۔ میں نے پوچھا آخر کیوں؟ کہنے لگیں۔ مولانا کے بھانج داماد کی لڑکی جہاں آرا پاکستان سے آئی ہے۔ میں نے سوال کیا:۔

"کیا وہی جہاں آرا جو اب سے آٹھ سال پہلے بارہ سال کی بچی تھی؟"

"ہاں ہاں وہی ــــ اب کیا ساری زندگی وہ بارہ ہی سال کی رہے جائے گی ــــ"

"مگر خالہ جان۔ پاکستان سے تو روز ہی کوئی نہ کوئی آتا رہتا ہے ــــ ان لوگوں سے بھلا ہمارا کیا رشتہ۔"

خالہ کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ تڑخ کر بولیں:۔

"تو تو سدا کا بدھو ہے۔ ارے مولانا بدرالدین کے گھرانے سے تو ہماری پرانی رشتہ داری ہے۔"

"نہیں خالہ جان ــــ پرانی رشتہ داری تو ساری دنیا ہی سے نکل آئے گی۔ آخر سبھی اماں حوا کی اولاد ہیں ــــ مجھے تفصیل سے بتائیے کہ خاص طور پر مولانا بدرالدین کے گھرانے سے ہمارا کیا رشتہ۔"

انھوں نے پان دان سرکا کر ایک پان کھایا پھر مشفقانہ لہجے میں کہنے لگیں:۔

"دیکھ یوں سمجھ۔ بادشاہ جہانگیر کی فوج میں دیوان صبغۃ اللہ جو تھے ان کی تین لڑکیاں اور چار لڑکے تھے۔ بڑی لڑکی داروغہ شریف علی کے منجھلے لڑکے مہابت علی سے بیاہی اور مہابت علی کی چچازاد بہن فرید النساء کا عقد داروغہ جی کے بڑے سالے مکرم جاہ سے ہوا۔"

"ذرا ٹھیریئے خالہ جان" میں گھبرا کر بولا "دیوان شریف اللہ کی چار لڑکیاں اور تین لڑکے۔"

"دیوان شریف اللہ کے نہیں۔ ان کا نام صبغۃ اللہ تھا۔ آگے سن۔ مکرم جاہ کے دو لڑکے ہوئے جن میں ایک مولوی لطافت کے خاندان میں بیاہا اور دوسرا بدنصیب آوارہ گردی میں پھنس گیا۔ وہ ایک میم بیاہ لایا تھا۔ خیر اس سے ہمیں کیا لینا۔ مولوی لطافت کے ہم زلف خواجہ منور علی کی دوسری پیڑھی میں دیوان صبغۃ اللہ کی چھوٹی نواسی سے ان کے سوتیلے چچا نے عقد کیا۔ انھی کی اولاد میں ایک شاخ سے تیرے ماموں کے دادا پیدا ہوئے۔ دوسری شاخ سے مولانا بدرالدین کے پرنانا پیدا ہوئے۔"

یہ کہہ کر خالہ جان نے پان کی پیک اگالدان میں اُلٹنے کے لئے فل اسٹاپ کیا۔ تیور بتا رہے تھے کہ فارغ ہوتے ہی پھر مجھے مزید قائل کرنے کی کوشش کریں گی۔ میں نے جلدی سے کہا:۔

"ٹھیک ہے خالہ جان۔ بالکل سمجھ گیا۔ واقعی ہم سب تو ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔"

"اور نہیں تو کیا ــــ تیرے دادے کے خالہ زاد بھائی مولوی فقیہہ الحسن مولانا بدرالدین کے پرنانے کے سگے ماموں کی لڑکی کا دودھ پیئے ہوئے ہیں۔ تم نئے زمانے کے لونڈے، رشتے ناطے کیا جانو۔ خبردار نسیمہ کو سویرے بھیجدینا اگر دیر ہوئی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

"مجال ہے خالہ جان ــــ سن رہی ہو" میں نے ملائن کی طرف رُخ پھیرا "کل سویرے ہی جہاں آرا سے ملنے جانا ہے ــــ آپ بے فکر رہیئے خان۔ آپ کا حکم اور یہ ٹالدے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"جگ جگ جیو۔ اچھا میں چلی ــــ ویسے تو جتنا بدبنا ہے میں خوب جانتی ہوں۔"

وہ ایک پیارا سا چپت جھاڑ کر رخصت ہو گئیں تھیں اور میں رات کے بارہ بجے تک اسی اُدھیڑ بُن میں کروٹیں بدلتا رہا تھا کہ چار لڑکیاں اور تین لڑکے جن بزرگوار کے تھے ان کا نام لطف اللہ تھا یا صبغت علی۔ ناموں کی ایک فوج دماغ کے لان میں دوڑتی پھر رہی تھی۔ طبیعت بہت اُلجھی تو میں نے ملائن سے دریافت کیا:۔

"بھئی بتانا ــــ منیف علی صاحب کی بڑی لڑکی سے جن صاحب کے چھوٹے لڑکے نے شادی کی تھی ان کا نام خالہ نے کیا بتایا تھا؟"

"بتایا ہوگا کچھ" وہ اُلجھ کر بولی "آپ سو جائیے۔"

"نیند کے بغیر کیسے سوؤں۔ اب یہ تو بتاؤ کل شام ناشتہ کون تیار کر کے دے گا۔ تمھیں خبر ہی ہے شکار کا پروگرام سیٹل ہو چکا ہے۔"

"میں اس میں کیا کر سکتی ہوں۔ جہاں آرا سے ملنے تو جانا ہی پڑے گا۔"

"کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جہاں آرا ہی تم سے ملنے آجائے آخر تم تو اس سے کتنے ہی سال بڑی ہو۔ چھوٹے بڑوں سے ملنے آیا کرتے ہیں۔"

"کیا میں اُسے خط لکھوں کہ مجھ سے ملنے آجاؤ؟"

"کسی سے کہلا کر بھیج سکتی ہو۔ ہم بھی تو دیکھیں آٹھ سال بعد وہ کیا بن کر آئی ہے۔"

"اگر تم سے پردہ کرتی ہوئی ـــ تو۔؟"

"پھر میں سمجھوں گا وہ عربستان سے آئی ہوگی۔ پاکستان سے تو نہیں آسکتی۔"

"خیر اب سو جائیے۔ صبح اُٹھنا بھی ہے۔"

"کیا منھ اندھیرے بھاگو گی؟"

"بھاگیں میرے دشمن ـــ آج صبح کی نماز قضا ہو گئی تھی۔"

"اب اتنا تقویٰ مت جھاڑو ـــ ہم بیسویں صدی میں رہ رہے ہیں ـــ دیر سے سو دیر سے اٹھو۔ یہ ہمارا پہلا اصول ہونا چاہیئے ـــ ہاں تو بتاؤ ناجن بزرگوار کے تین لڑکیاں اور چار لڑکے تھے۔۔۔"

"خدا کے لئے بور مت کیجئے۔ جاگنا ہے تو پھر ڈھنگ کا کوئی موضوع چھیڑیئے۔"

"شاید بھول گئیں ـــ ہم میاں بیوی ہیں۔ ہماری گفتگو موضوع کی پابند نہیں ہو سکتی۔"

"پھر آپ بولے جائیے ـــ میں تو سوئی۔"

پرابلم اصل میں یہ تھا کہ کل شام کے لئے مرزا کہرام اور خواجہ شیون کے ساتھ مچھلی کے شکار کا پروگرام طے ہو چکا تھا عصر کے بعد جانا۔ رات بھر ندی پر رہنا۔ اگلی صبح لوٹنا۔ پراٹھے، کباب اور آملیٹ ساتھ لے چلنا میرے ذمے تھا۔ ظاہر ہے یہ چیزیں ملائن ہی تیار کرتی۔ مگر وہ جہاں آرا سے ملنے جا رہی تھی۔ رات تو کسی طرح میں نے کاٹ ہی دی مگر صبح پھر موصوفہ سے عرض کیا کہ اے روحِ تمنا۔ آج مت جائیے۔ ظہر کے بعد زادِ راہ تیار کرنا ہے۔ وہ تبسم کی لہر کو ہونٹوں میں دبا کر بولی:۔

"اگر میں گیارہ بجے تک جہاں آرا کے یہاں نہ پہنچی تو خالہ امتل پھر یہیں آدھمکیں گی ـــ کیا آپ ان کا مقابلہ کر سکیں گے؟"

"میں نیپولین تک کا مقابلہ کر سکتا ہوں ـــ تم کل چلی جانا۔ جہاں آرا تو ابھی ہفتوں ٹھیرے گی۔"

"اب میں تو ارادہ کر چکی ہوں ـــ آپ ہی جو شکار کو کل پر ملتوی کر دیں۔"

"اللہ کی بندی۔ میں تو ملتوی کر دوں مگر مچھلیاں تو اپنا پروگرام ملتوی نہیں کریں گی۔ تمھیں کیا معلوم۔ خواجہ شیون نے علم نجوم کے ذریعے پتہ چلایا ہے کہ مچھلیوں کا ایک قافلہ آج رات ہنڈن ندی سے گذرے گا ـــ اب تم خود سوچ لو شکار کے لئے کتنا زریں چانس ہے۔"

"میری سمجھ میں آپ کے دوست نہیں آتے۔ خواجہ شیون۔ صوفی نمکین۔ مرزا رستم۔ یہ آخر کیا بلائیں ہیں۔"

"اوہو۔ اب تم میرے دوستوں کی توہین کرو گی۔ خواجہ شیون تو خواجہ ملاحت علی نقشبندی کے خلیفۂ مجاز ہیں اور صوفی نمکین شاہ تصوف علی سہروردی کے منجھلے خلیفہ مرزا رستم ـــ"

"بس خدا کے لئے ـــ مجھے یہ شجرے آپ دس دفعہ سنا چکے ہیں۔ اب آپ اپنے مضمون میں لگئے ـــ"

"مضمون کی ایسی تیسی۔ کیا تم سمجھتی ہو میں تمھارے بغیر بھی مضمون لکھ سکوں گا ـــ"

"اب شاید آپ بھولے کہ ہم میاں بیوی ہیں ـــ"

"بے شک میں اپنی یادداشت کھو چکا ہوں۔ اس وقت تم مجھے کچھ اور ہی لگ رہی ہو۔ میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"یہ بات آپ خالہ کو سمجھانے کی کوشش کیجئے گا۔ وہ غالباً آتی ہی ہوں گی۔"

"خدا انھیں جلدی سے اُٹھالے ـــ خیر تم جاؤ میں مضمون وغیرہ پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

"نہیں۔ مضمون تو آپ لکھیں گے۔ بھیا سے آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ان کی واپسی سے پہلے ہی اپنا مضمون کاتب کے حوالے کردیں گے۔ اب ان کے آنے میں دن ہی کے باقی ہیں۔"

"بلا سے آئیں ـــ تم کیا سمجھتی ہو میں تمھارے بھیا سے ڈرتا ہوں۔"

"خدا نہ کرے آپ کسی سے ڈریں ـــ مگر وعدے کا پاس تو آپ بہرحال کریں گے۔"

"کس چڑیا کا نام ہے وعدہ۔ میں نے کلیر شریف میں مشتری جان پونا والی سے وعدہ کیا تھا کہ اگلے سال ضرور آؤں گا۔ مگر تین سال بیت گئے۔ وہ اگلا سال ابھی تک نہیں آیا ـــ"

"موضوع سے باہر مت ہوجیئے ـــ میں دس کا نوٹ آپ کو دیئے دیتی ہوں۔ زادِ سفر کسی ہوٹل سے لے لیجئے گا۔"

"فقط دس کا نوٹ ـــ اکیلے خواجہ شیون نور وٹیاں کھاتے ہیں۔ مرزا کہرام بھی آٹھ سے پہلے ہاتھ نہیں روکتے۔"

"پھر تو میرا گلوبند بیچ دیجئے۔ آخر یہ کیا مصیبت ہے کہ جائیں تو سب خواجہ صوفی اور ناشتہ دان بھروائیں آپ سے۔ یہ سب ـــ وہ ہیں کیا؟ ـــ"

"وہ؟"

"ہاں۔ جن کے بیویاں نہیں ہوتیں۔"

"تو رنڈوا کہو۔"

"مجھے یہ لفظ گالی لگتا ہے ـــ آپ بھی مت بولا کیجئے۔"

"پھر کہو گی آپ بھی چوڑیاں پہن لیجئے ـــ ارے بھاگوان غور تو کرو ہم کتنی میٹھی میٹھی باتیں کررہے ہیں۔ اٹھو تم چوکھے پر چلو۔ میں وہیں بیٹھ کر میٹھی میٹھی باتیں سناؤں گا۔"

"اب میں کپڑے بدل چکی۔ آپ بڑھ کر رکشا لے آئیے۔ جب تک میں آپ کے لئے بکس سے روپے نکال رکھوں گی۔"

"بیس روپے ـــ نہیں بلکہ پچیس۔"

"ہزار بھی ہوتے تو آپ پر نچھاور کردیتی ـــ کیا کروں اب تو فقط پندرہ پڑے ہیں۔"

"چلو پندرہ ہی سہی۔ بھینس کے کوفتے خرید لینگے۔"

مجھے یقین تھا کہ ملائن نے اگر اور دیر کی تو خالہ امثل کھٹ سے آلیں گی۔ پھر یہ بھی ممکن ہے کہ پیسے بھی نہ ملیں اور ملائن چلی بھی جائے۔ بس یہ سوچتے ہی میں کاغذات سمیٹے بغیر رکشا لینے اُڑا چلا گیا۔

بازار دور نہیں تھا مگر راہ میں منشی عنایت اللہ ٹکرا گئے انھیں اُردوئے معلّٰی میں گفتگو کا بڑا شوق ہے۔ پہلا ہی جملہ اتنا گاڑھا صادر کیا کہ میری طبیعت صاف ہوگئی۔ بے ساختہ زبان سے نکلا:۔

"حضرت میں اس وقت ذرا جلدی میں ہوں۔ انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔"

"آپ تو گویا دوامی طور پر سراپا تعجیل بنے رہتے ہیں۔ چند ثانیئے تو توقف فرمائیے۔"

"معافی چاہوں گا۔ کل وَل کو انشاء اللہ آپ کے گھر ہی پر حاضر ہوجاؤں گا۔"

"میاں ہم سوختہ سامانوں کا گھر کہاں۔ زوجہ اپنے والدین کے گئی ہوئی ہیں۔ خورونوش ریسٹوران میں ہو رہی ہے۔"

"انشاء اللہ واپس آئیں گی ـــ روٹھ کر تو نہ گئی ہونگی"

"واللہ اعلم بالصواب۔ ان کے قلب کا حال کون جان سکتا ہے۔ آپ سے ضبط تولید کے مسئلے پر کچھ تبادلۂ خیال کرنا تھا۔ نکالئے کوئی وقت۔"

"خیریت تو ہے۔ آپ نے تو پارسال نس بندی کرالی تھی۔"

"یہی تو ابتلا ہے۔ نس بندی کرالی تھی مگر زوجہ پھر کسی حال سے نظر آرہی ہیں۔ عقل حیران ہے کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔"

"بات تو واقعی تشویش کی ہے ـــ ان کی عمر غالباً تیس سے تو کم ہی ہوگی۔"

"جی اٹھائیس سال ـــ دیکھنے میں تو بیس بائیس ہی کی نظر آتی ہیں۔"

میں نے اہمیت اور تشویش دونوں کا اظہار کرنے کے لئے آنکھیں پھیلائیں۔ ایک ذو معنی سا ہنکارہ بھرا پھر یہ عرض کر کے آگے بڑھ گیا کہ مسئلہ نہایت اہم ہے۔ میں انشاء اللہ کسی وقت فرصت میں حاضر خدمت ہو کر اسے سلجھانے کی کوشش کرونگا۔

رکشا لیکر گھر لوٹا تو اپنے کاغذات پر نظر پڑتے ہی اندازہ ہو گیا کہ کسی نے انھیں کریدا ہے۔ ملائن رخصت کیلئے تیار تھی۔

"یہ میرے کاغذات کو کس نے الٹا پلٹا ہے؟"

"مریم آئی تھی۔ وہی الٹ پلٹ رہی تھی ــــ کچھ چرا کر تو نہ لے گئی ہوگی ــــ"

"تھا کیا جو لے جاتی۔ ابھی فقط عنوان لکھ پایا ہوں۔"

"آدھا گھنٹہ لگا دیا آپنے لوٹنے میں، حالانکہ رکشائیں دس قدم پر مل جاتی ہیں۔"

"منشی قناعت مل گئے تھے ــــ ارے ہاں کچھ خبر بھی ہے قناعت صاحب کی زوجہ پانچویں بچے کو جنم دینے والی ہیں ــــ"

اس کا منھ حیرت سے پھیلا ہی تھا کہ اتنے میں رکشا والے کی آواز آئی۔ اب کیا گفتگو چلتی۔ وہ کھٹ پٹ کرتی ہوئی رخصت ہوئی۔ میں نے کاغذات سنبھالے۔ مریم ہمارے ہمسائے ڈاکٹر تصویر کی لڑکی ہے۔ عمر ۱۹ سال۔ زبان اور دماغ دونوں تیز۔ میرا دماغ چاٹنا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس وقت خدا جانے اتنی جلدی کیوں لوٹ گئی ہوگی ورنہ گھنٹہ بھر تو ضرور بھیجا کھاتی۔ میٹرک میں پڑھتی ہے افسانہ نگاری کا بھی شوق ہے۔

عنوان والا کاغذ سامنے رکھ کر میں نے قلم نکالا ہی تھا کہ اچانک دل کو دھکا لگا۔ پیسے لینے تو ملائن سے یاد ہی نہیں رہے تھے ــــ مار ڈالا ظالم نے۔ یار رزاق تیری بھی دہائی ہے۔ اب بھلا مضمون یضمون کس سے لکھا جاتا۔ دماغ کھول گیا تھا۔ اسی وقت مولوی یامان آدھمکے۔

"ارے بھئی سنا ہے مولانا مودودی پر مضمون لکھا ہے۔"

"میں ہمیشہ کاغذ پر مضمون لکھتا ہوں۔" میرے منھ سے جھلاہٹ میں نکلا۔ "بھلا آپ سے کس نے کہا یا۔"

"ڈاکٹر تصویر صاحب کے یہاں ذکر ہو رہا تھا۔ سچ بتاؤ کیا واقعی مولانا مودودی کی چوری پکڑی گئی ہے؟"

"معلوم ہوتا ہے مریم نے عنوان دہرا دیا ہے۔ ارے صاحب مضمون کس کمبخت نے لکھا ہے۔ ابھی تو بس عنوان جمایا ہے ــــ"

"خیر زبانی ہی بتا دو کیا واقعہ ہوا؟"

"اب زبانی تو مشکل ہے۔ پڑھ لیجئے گا جب تجلی میں چھپے گا ــــ"

"بڑا انتظار کراؤ گے ــــ خدا کی قسم پیٹ بھر کر مٹھائی کھلاؤں گا اگر تم نے ثابت کر دیا کہ مودودی صاحب چور بھی ہیں۔"

"چور تو وہ ہمیشہ کے ہیں۔ ان کی ساری زندگی قرآن اور حدیث کے مضامین چرانے میں گذر رہی ہے۔"

"وہ خیر اور بات ہے۔ ذرا واقعی چوری ثابت ہو جائے پھر دیکھنا کتنی زوردار رپورٹ اخباروں میں بھجواتا ہوں۔ کھیں قسم ہے اپنے سر کی رعایت مت کرنا ــــ ویسے اعتبار تمھارا کچھ نہیں ہے۔"

"حوصلہ افزائی ہے آپ کی۔ رعایت کا خانہ میرے یہاں ہے ہی نہیں۔"

وہ خوش خوش گئے۔ خوش کیسے نہ جاتے۔ اہل قرآن کے ہم مسلک ہیں۔ مصری فلسفۂ قومیت میں یقین رکھتے ہیں۔ مولانا مودودی سے بے حد بیزار ہیں۔ وہ گئے تو دس ہی منٹ بعد محمد رفیق صاحب آدر آمد ہوئے۔ یہ جماعت اسلامی کے ہمدردوں میں ہیں۔ مولانا مودودی سے عشق فرماتے ہیں۔ بڑے فکر آمیز لہجے میں پوچھنے لگے:۔

"کیا ملا صاحب مولانا مودودی کے یہاں چوری ہو گئی؟"

"آپ کو بھلا کیسے پتا چلا؟"

"گھر پر ذکر ہو رہا تھا کہ آپ کوئی خبر اخبار میں بھیج رہے ہیں جس کا عنوان ہے مولانا مودودی کی چوری۔"

"پھر آپنے کیا مطلب سمجھا؟"

"یہی کہ کسی بدبخت نے مولانا مودودی کے گھر میں نقب وقب لگا لیا ہوگا ــــ خدا را بتائیے نقصان کچھ زیادہ تو نہیں ہوا؟ ــــ"

"یہ سب آپ اخبار میں پڑھیئے گا ـــ میرا دماغی توازن آج درست نہیں ہے۔"

"بے شک آپ بہت متاثر ہوں گے۔ مولانا مودودی سے تو آپکا تعلق بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے۔"

وہ رخصت ہوئے تو تھوڑی ہی دیر بعد خلیفہ خنجر نے شرفِ دیدار عطا کیا۔ ان کا پورا نام محراب علی خنجر ہے۔ خنجر تخلص رکھا تھا مگر وہ نام سے بھی آگے نکل گیا۔ روحانی رشتے سے میرے ہم زلف ہیں ـــ سمجھتے ہیں نا آپ ہم زلف؟ ـــ چار سال پہلے میں اور وہ ایک ساتھ کسی کافر ادا کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہوئے تھے۔ یہ کافر ادا کلیر کے عرس میں نظر آئی تھی۔ بلا کی شوخ و شنگ۔ بے حد اللہ والی۔ چھوٹی سی عمر میں سلوک کی بے شمار منزلیں طے کر گئی تھی۔ خلیفہ خنجر صاحب کے خیال کے مطابق اس کے مرمریں پیکر میں چشتی، قادری اور سہروردی نسبتوں کا ایسا نفیس اجتماع ہوا تھا جو بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ تو ہم دونوں ایک ہی وقت میں اس کی ریشمی زلفوں سے بندھ گئے اور ہم زلف قرار پائے۔ وہ دراصل دو چوٹیاں گوندھا کرتی تھی۔ اسی لئے بیک وقت ہم دونوں کے اسیر ہونے میں دقت پیش نہیں آئی۔ عقائد کے اعتبار سے خلیفہ خنجر کا تعلق بریلی اسکول سے ہے۔ مجھے وہابی مودودیہ کہتے ہیں لیکن عشق نے تو کبھی ذات پات کا فرق تسلیم ہی نہیں کیا۔ اسی لئے ہم زلف بننے کے بعد ہم میں لڑائی نہیں ہوتی۔ لڑائی کیا ہوگی ہم تو دونوں اکثر ایک ساتھ سنیما جاتے ہیں۔ جب بھی وجینتی مالا کی کوئی فلم آئی ہم دونوں پہلے شو میں پہنچے۔ ہم دونوں ہی کی دانست میں وجینتی مالا کی شکل اس کافر ادا سے ملتی ہے جس کا مختصر تعارف جناب جگر مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ اس شعر میں کرا گئے ہیں:-

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے

کنڈی کھٹکی تو میں جھلا کر دہاڑا ـــ "کون ہے؟"
جواب ملا ـــ "میں تھا خنجر ـــ"
"اندر ہی آجائیے" ـــ میرا طیش بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ فیلِ مست بے زنجیر کی طرح جھومتے جھامتے اندر آئے۔

"کیا بیگم صاحبہ کہیں تشریف لے گئی ہیں؟" انھوں نے باورچی خانے سے لیکر کمرے تک کا جائزہ لینے کے بعد سوال کیا۔

"نہ لے جاتیں تو آپ اندر کیسے تشریف لاتے۔ کرسی پر بیٹھیئے۔"

"اب چائے کون بنائے گا ـــ چلو تم ہی بناؤ۔"
"نہیں بنا سکوں گا ـــ خنجر صاحب آج طبیعت بہت خراب ہے۔"
"وہ تو ہم بھی سمجھتے ہیں!؟" وہ بڑے چبھتے ہوئے لہجے میں بولتے گئے "تم پر صدمہ پڑا ہے ـــ تمھارے مولانا مودودی کو کوئی چرا کر لے گیا ـــ مگر یار تم اتنے دنوں سے کاغذ قلم کے ساتھ جھک مار رہے ہو اتنا تو سوچا ہوتا کہ ایسے موقع پر چوری کا لفظ نہیں بولتے ـــ اغوا بولتے ہیں۔"
"اغوا ـــ!" میرے بدن میں سنسنی دوڑ گئی۔
"ہاں جانِ خنجر ـــ لکھنا سیکھو ـــ ہم تمھیں چڑائیں گے نہیں۔ ہمیں تو پہلے ہی اندازہ تھا کہ ایسے لوگوں کا یہی حشر ہونا ہے۔ قوم آخر کہاں تک برداشت کرتی۔"
تو آپ تک بھی عنوان پہنچ گیا ـــ شاید مریم کی بچی نے ڈھنڈورا پٹوایا ہے ـــ سچ بتائیے آپ سے کس نے کہا ـــ کیا کہا؟"
ـــ "ہم ڈاکٹر تصویر صاحب کو نبض دکھانے گئے تھے، وہیں پتہ چلا کہ تمھارے پاس پاکستان سے خبر آئی ہے۔"
"کیا خبر آئی ہے؟"
"مولانا مودودی کی چوری ہو گئی ـــ ہم نے سوچا تم اپنے یار ہو چلو تعزیت کر آئیں۔"
"تعزیت!"
"نہیں تو کیا ـــ اب کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ چرانے والے انھیں زندہ چھوڑ دیں گے۔"
"اس پہلو پر میں نے غور ہی نہیں کیا ـــ"

"تمھارے غور کرنے نہ کرنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ۔۔ اغوا کرنے والے انھیں کیفر کردار کو پہنچا کر دم لیں گے۔ ہم پہلے ہی تم سے کہا کرتے تھے کہ مودودیت کے چکر میں نہ پڑو ۔۔۔ اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لیکر۔"

"ہائیں۔ آپ نے کیا اقبال کو بھی پڑھا ہے؟"

"کون ہے جسے ہم نے نہیں پڑھا۔ اقبال کے عقائد درست نہیں تھے مگر شعر کبھی کبھی کام کا کہتا تھا ۔۔۔ میاں ہمیں کیا لینا اقبال سے۔ تم چائے بناؤ ۔۔۔"

"ایک مہینے سے وحیدہ مالا کی کوئی فلم نہیں لگی خنجر صاحب ۔۔۔ آخر اب کس طرح زندہ رہا جائے گا۔"

"میاں ہاں ۔۔۔ پرسوں اپنے خواجہ سرفراز کیساتھ ہم نے وحیدہ رحمان کی فلم دیکھی تھی۔ اس میں بھی اسی کلیر والی کی حور مارتی ہے۔ ناک تو بالکل ویسی ہی ہے۔ ہونٹوں میں بھی کافی شباہت ہے۔"

"اچھا تو اکیلے اکیلے دیکھ آئے۔ افسوس آپ نے ہمزلفی کی بھی پروا نہیں کی۔"

۔۔۔ "باللہ العظیم تم یاد تو آئے تھے۔ مگر موقعہ ہی کچھ ایسا تھا کہ تمھیں لینے آتے تو بہت سا کھیل نکل جاتا ۔۔۔ چلو آج پھر ہم تم دیکھ آئیں گے۔"

"آج تو شکار کا پروگرام ہے ۔۔۔ چلئے نا آپ بھی۔"

"شکار کا ہیکار ان سنت ۔۔۔ ہمیں کہاں اتنی فرصت۔"

"واقعی آپ کے لئے مشکل ہے ۔۔۔ ویسے چلتے تو تفریح اچھی رہتی۔ مرزا کہرام کی اہلیہ بھی ساتھ چل رہی ہیں۔"

"نہیں!" وہ اچھل پڑے۔ "سچ کہنا ۔۔۔ بکواس تو نہیں۔"

"یقین مانیئے ۔۔۔ ایسا ہی پروگرام ہے۔"

"پھر تو ہم فرصت نکال لیں گے ۔۔۔ ہاں آج تو ایسی کوئی مصروفیت بھی نہیں۔ کس وقت چل رہے ہو؟"

"مغرب کے وقت ۔۔۔ مگر ایک رکاوٹ بڑی بے ڈھب ہے ۔۔۔ سفری ناشتے کا انتظام میرے ذمے تھا مگر آپ دیکھ ہی رہے ہیں زوجہ صاحبہ غائب ہیں۔"

"پروا مت کرو ۔۔۔ کیا تیار ہونا ہے؟"

"بس یہی چار پانچ آدمیوں کا ناشتہ ۔۔۔"

"صرف آدمیوں کا ۔۔۔ اور مرزا کہرام صاحب کی اہلیہ؟"

"انھیں بھی آدمیوں ہی میں شمار کر لیا ہے۔ وہ اور آپ ملا کر پانچ ہوتے ہیں۔"

"پھر تو ٹھیک ہے۔ دو ناشتے دان بھروا لیں گے۔ کہو تو ایک ناشتہ دان فرنی کا بھی بھروا لیں۔"

"کیا مضائقہ ہے ۔۔۔ ہائے خنجر صاحب۔ اگر آپ کلیر شریف میں بھی ایسی ہی دریا دلی دکھلاتے تو وہ دنبالۂ عالم کنی نہ کاٹ جاتی۔"

"اب کیا کہدیں۔ اس زمانے میں ہاتھ تنگ تھا۔ جتنی رقم لے گئے تھے وہ ایک رات پہلے شریفن بائی کے مجرے میں برباد ہو گئی تھی۔ کیا پتا تھا کہ کل ایک فتنۂ عالم سے ملاقات ہونے والی ہے ۔۔۔ خیر گذشتہ را صلوات آئندہ را احتیاط ۔۔۔"

جب وہ خوش خوش چلے گئے تو مجھے بجائے مضمون کے اس مسئلے پر دماغ لڑانا پڑا کہ بکواس تو کر دی مگر اب کسے مسز کہرام بنا کر ساتھ لے جانا پڑے گا۔ مسز کہرام بے شک ایک وجود رکھتی ہیں۔ خلیفہ خنجر صاحب نے ایک موقعہ پر انھیں دیکھا بھی ہے۔ لیکن مرزا کہرام تو پیٹ میں چاقو اتار دیں گے اگر ان سے کہا گیا کہ اپنی اہلیہ کو بھی شکار میں لے چلو۔ تہمتے کی جرأت ہی کون مردود کر سکتا ہے۔ مچھلی کا شکار تو یوں بھی پوری تاریخ میں کبھی کسی عورت نے نہیں کھیلا۔ مسز کہرام کیا کھیلیں گی۔ وہ تو ویسے بھی عورت کم لڑکی زیادہ ہیں۔ پھر کیا ہو۔ خنجر صاحب تو جینا دوبھر کر دیں گے۔ لعنت ہے میری عقل پر۔ کبھی کبھی تو ایسی مت ماری جاتی ہے کہ خدا غارت ہی کر دے۔

دیر تک دماغ کھپانے کے بعد سمجھ میں یہ آیا کہ صوفی تلقین سے مدد لی جائے۔ وہ چھریرے بدن کے بھی ہیں اور تھیٹر میں بھی کچھ دنوں کام کر چکے ہیں۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ

آواز بھی باریک ہے۔ خنجر صاحب ان سے واقف بھی نہیں ہیں۔ اگر برقعہ اوڑھ کر مسز کہرام بن گئے تو بقول شاعر "عجب کیا ہے یہ بیڑا پار ہو جائے"۔ بھوکا پیاسا ان کے گھر شیخ پورے پہنچا۔ وہاں سے پتہ چلا کہ وہ مولوی فنجان علی کے یہاں دعوت میں گئے ہیں۔ ایک میل دور مولوی فنجان کے گھر پہنچا تو وہاں سے پتہ چلا کہ ابھی ابھی خواجہ قمر الحسن کے یہاں تشریف لے گئے ہیں۔ قیلولہ وہیں کریں گے۔ پیروں درد ہو گیا دوڑتے دوڑتے۔ آخر کار جوئندہ یابندہ۔ دو گھنٹے بعد ملاقات ہو ہی گئی۔ بڑی عاجزی سے حرفِ مدعا گوش گذار کیا۔ پہلے تو خفا ہوئے۔ پھر نرم پڑے۔ پھر کہنے لگے:۔

— "آج ہمیں کالے نگر کا مولود پڑھنا ہے۔ یہ مجبوری نہ ہوتی تو تمھاری بات ہم نہیں ٹال سکتے تھے۔"

"مولود تو صوفی صاحب ہوتا ہی رہتا ہے۔ خدا کے لئے مایوس نہ کیجئے۔ خلیفہ خنجر تو میری جان ہی نکال لیں گے۔"

وہ پل بھر کچھ سوچتے رہے — پھر مسکرا کر بولے:۔

"اچھا وعدہ کرو اب کی سال عرس کلیر میں ہمارے ساتھ چلو گے —"

"سر کے بل چلوں گا صوفی صاحب — آپ کہیں اور میں نہ چلوں — وعدہ سو فی صدی وعدہ۔"

"تو چلو ہم بھی تمھارے کام آ ہی جائیں گے — مگر لباس وغیرہ سب تمھارے ذمے۔"

"بالکل ذمے — آج اپنی زوجہ گھر پر نہیں ہے۔ بعد مغرب آئے گی۔ آپ عصر کے وقت غریب خانے ہی پر پہونچ جائیں۔ وہیں سب میک اپ وغیرہ ہو جائے گا — ٹھیک ہے نا —"

"جیسی تمھاری مرضی۔ اپنا تو مشرب پیر دستگیر کے صدقے سے یہی ہے کہ دل بدست آور کہ حج اکبر است —"

آگے کیا ہوا — یہ سب بیان کرنے کے لئے مجھے نیا عنوان تلاش کرنا پڑے گا — موجودہ عنوان کے ذیل میں جو کچھ بیان ہو سکتا تھا وہ بیان ہو چکا۔ اب آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ شروع میں جو دعویٰ میں کر آیا ہوں اس کی جڑ بنیاد کیا تھی۔ ایک ہی عنوان اور تین مطلب۔ خود میرے ذہن میں اسے سپرد قلم کرتے وقت کونسا مطلب تھا اب یہ بھی یاد نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ کوئی نہ کوئی مطلب تھا ضرور۔

اگلا ایک ہفتہ عجیب حالات میں گذرا۔ شکار سے واپسی تو پروگرام کے مطابق اگلی صبح ہی ہو گئی تھی۔ مگر یہ شکار ایسا ہنگامہ خیز ثابت ہوا کہ ایک ہفتے تک اس کے نتائج بھگتنے پڑے۔ پھر اس مصیبت نامے سے نجات ملی ہی تھی کہ مدیر تجلی کی واپسی کا پیامِ مرگ آ پہنچا۔ پیامِ مرگ اس لئے کہ ان سے مجھ بدبخت نے بڑے شد و مد سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک آپ حج سے لوٹیں میرا مضمون کتابت کے مراحل سے گذر چکا ہوگا۔ لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ عنوان سے آگے اب تک ایک سطر بھی نہیں لکھی گئی — لکھنے بیٹھتا تو صوفی تلقین کے شاندار میک اپ سے لے کر مشرقِ وسطیٰ کی سیاست تک دنیا بھر کے مسائل منھ پھاڑے سامنے آ کھڑے ہوتے۔ ملائن الگ جان لئے ہوئے تھی۔

"لکھ ڈالئے نا — کچھ تو لکھئے — ایسی بھی کیا غائب دماغی — قلم چلائیے کچھ تو لکھا ہی جائے گا۔"

اب اور بھی غصہ آتا — کتنا عبرتناک ہے اس بدبخت شوہر کا حالِ تباہ جس کے حق میں خود اس کی بیوی ناصح مشفق بن جائے — مرگِ غیرت تری دہائی ہے —

لیجئے وہ صبح بھی آ گئی جس کی دوپہر میں قبلۂ عالم دیوبند پہنچ رہے ہیں۔ مریم اور ملائن نے مل کر گھر کو دلھن بنا دیا ہے۔ ان دونوں کے چہرے گلاب کے پھول کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔ میں بدنصیب قلم انگلیوں میں پکڑے کاغذ پر جھکا بیٹھا ہوں کہ برا بھلا کچھ تو مضمون ٹپکے مگر ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ معدے کا قبض دماغ کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔ ملائن نے میری یکسوئی کی خاطر مریم کی زبان بند کر رکھی ہے مگر وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی فقرہ کھینچ ہی جاتی ہے۔ مثلاً:۔

"آپ کا تو عنوان ہی پورا مضمون ہے۔ کیا کریں گے آگے لکھ کر۔"

"قلم چلانا آپ کے بس کا روگ نہیں — پرچون کی دکان کھول لیجئے۔"

"ہائے اللہ ــــ کتنی مایوسی برس رہی ہے بیچاروں کے چہرے پر ــــ"

میں خون کے گھونٹ پیتا ہوں۔ مواد سامنے ہے مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مواد سے کیا ثابت ہو رہا ہے۔ آیا مولانا مودودی کی کوئی چیز چوری گئی یا خود مولانا ہی نے کسی کے مال پر ہاتھ صاف کیا ــــ حد ہے کہ یہ خیال بھی دماغ میں جڑ پکڑتا جا رہا ہے کہ خدانخواستہ مولانا مودودی ہی تو چوری نہیں ہو گئے ــــ عجیب و غریب تکون ــــ بھیانک مثلث ــــ اب اگلا اسٹیج شاید مالیخولیا کا آئے گا۔ کپڑے پھاڑ کر صحرا کا رخ کروں گا۔

"ارے یہ آپ کیا کر رہے ہیں" ــــ دفعتاً ملائن کی آواز کانوں سے ٹکرائی اسی وقت مریم کا قہقہہ بھی بلند ہوا۔ وہ دونوں مجھے گھور رہی تھیں۔ قریب تھا کہ میں شیر کی طرح گرجوں مگر گرجنے سے پہلے ہی مجھے اپنی اس سچوئیشن کا احساس ہو گیا کہ ماچس کی تیلی ہونٹوں میں دبا رکھی ہے اور سگریٹ کو ماچس پر رگڑ رہا ہوں۔

"تم اپنے کام سے کام رکھو" میں نے بُرے سے لہجے میں کہا "میرے دماغ کا کباڑا تمھیں لوگوں نے کیا ہے۔"

"غصہ کرنا سیکھئے" مریم پھٹ سے بولی "آپ کے چہرے پر تو یتیمی برس رہی ہے ــــ"

"ارے چپ رہ ــــ" ملائن نے اسے جھڑکا۔ پھر مجھ سے بولی ــــ "سرتاج من سلامت۔ آپ لکھنے پر توجہ دیجئے۔ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔"

"میں پابند نہیں ہوں لکھنے کا ــــ تم سمجھتی ہو تمھارے بھیا گولی سے اُڑا دیں گے۔"

"نہ اُڑائیں گولی سے" مریم بولی "مگر جینا تو دوبھر کر ہی دیں گے۔ میں انھیں بتاؤں گی کہ آپ کسی صوفی ٹوفی کو عورت بنا کر شکار پر لے گئے تھے ــــ"

"بہت بتایا ــــ زبان کاٹ کر گدی میں لگا دونگا۔ ــــ ارے تم ہر معاملے میں ٹانگ کیوں اڑاتی ہو ــــ"

"میں آپ کی اُستانی جو ٹھیری۔ پڑھیئے بی آئی آر ڈی برڈ۔ برڈ معنی چڑیا ــــ"

"جتنی انگریزی تم جانتی ہو اتنی تو میں نے پڑھ کر بھلا دی ہے۔ اچھا بتاؤ احمق لڑکی کو انگریزی میں کیا کہیں گے؟"

"احمق لڑکیاں انگریزوں میں ہوتی ہی نہیں۔ آپ بتائیے فضول آدمیوں کو فارسی میں کیا کہتے ہیں؟"

"اب دیکھ رہی ہو تم اسے" میں نے ملائن سے احتجاج کیا "پھر کہو گی مضمون نہیں لکھا۔"

"بس لکھ چکے آپ" ملائن بولی ــــ "یہ تو میرا مقدر بن گیا ہے کہ بھیا آپ پر غصے ہوا کریں اور میں بے بسی سے دیکھا کروں۔"

"مت دیکھا کرو ــــ آنکھیں بند کر لیا کرو ــــ میں خوب سمجھتا ہوں تم مزے لیتی ہو۔ خوش ہوتی ہو ــــ اللہ سے ڈرتیں نہیں۔ شوہر کی کوئی قدر تمھارے دل میں نہیں۔"

"آپ تو اللہ سے بہت ڈرتے ہیں" مریم نے دخل دیا۔ "اسی لئے گدھوں سے دوستی کر رکھی ہے۔ اچھا آپ کو میری قسم۔ بتائیے تو اس پاگل نے آپ کو زندہ کیسے چھوڑ دیا جب اسے پتہ چلا ہوگا کہ یہ مسز کہرام پہرام کچھ نہیں صوفی کا بچہ ہے ــــ"

"دیکھ رہی ہو" میں نے احتجاج کے طور پر ملائن کو گھورا ــــ "گدھے۔ پاگل۔ بچہ۔ یہ میرے دوستوں کو خطاب دیئے جا رہے ہیں۔ پھر میں کان کھینچوں گا تو تم کہو گی کہ اس کی عمر انیس سال ہے ــــ"

"خدا تم دونوں ہی پر رحم کرے ــــ میری بلا سے لڑو کھپو ــــ مجھے تو ابھی اور بھی کام دیکھنے ہیں۔"

مریم میری کھوپڑی کو بالکل صفاچٹ کئے بغیر ٹلنے والی نہیں تھی مگر وہ تو خدا نے کرم کر دیا کہ اس کا چھوٹا بھائی ڈیڈی کے حوالے سے اسے بلا لے گیا۔ اب میں نے بڑے ہی آہنی عزم و ارادے کے ساتھ مواد پر نظر ڈالی اور پھر یہ بات یاد آ ہی گئی کہ جب میں نے عنوان لکھا تھا تو اس کا مدعا یہ ثابت کرنا تھا کہ مولانا مودودی نے اپنی بعض تحریروں میں چوری کا ارتکاب کیا ہے۔ معمولی چوری نہیں بلکہ پوری پوری عبارتیں ــــ دن کی روشنی میں سینہ تان کر۔ بقول شاہ زمرد مونچھوں پر تاؤ دے کر۔ بقول بھوندو قوال ڈنکے کی چوٹ ــــ

اب میں نے ذیلی عنوان فوراً یہ لگایا:۔

چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد

پھر قلم کے اسپ تازی کو ایڑ لگائی تو آگئی طبیعت جولانی پر۔ ایک ہی سانس میں ساڑھے گیارہ سطریں لکھیں۔ پھر دوسرے سانس میں بائیس لکھتا مگر اسی وقت گھنٹے نے ٹناٹن گیارہ بجائے۔ ملائن بولی:۔

"اسٹیشن نہیں جائیں گے؟۔ گاڑی میں فقط پینتالیس منٹ رہ گئے ہیں۔"

"کونسا فرض واجب ہے جانا۔ آپکے بھائی صاحب ہی تو ہیں لاٹ صاحب تو نہیں ہیں۔"

"بس جھٹ پٹ اُٹھ جائیے۔" اس نے قلم میرے ہاتھ سے چھین لیا۔

"یہ مت سمجھو میں قلم کا محتاج ہوں ـــ کان کھول کر سنو ـــ لہو میں دل کے ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے۔"

"ہاں ہاں آپ ہیں مارخاں ہیں ـــ اُٹھ جائیے نہیں تو ساری زندگی کو بات رہ جائے گی کہ غیر سے غیر بھی گئے مگر آپ نہیں گئے اسٹیشن۔"

اسی وقت چنو۔ منو۔ ٹنو۔ کھنو سب آگئے۔ انھیں اسٹیشن لے جانا تھا۔ یہ اپنے ہی کنبے کے چشم و چراغ ہیں۔ دیوبند میں جب بھی کوئی میلہ ٹھیلہ ہوتا ہے ان کی مائیں ان کے منھ دھو دھو کر میری طرف ہنکا دیتی ہیں کہ جاؤ ملا تمھیں سیر کرا لائے گا۔ آج الحاج مدیر تجلّی حج سے آرہے ہیں۔ یہ بھی میلہ ہی تو ہے۔ بڑے تو رکشا اور تانگوں میں جائیں گے۔ یہ چھوٹے میری گردن اور پیٹھ اور کھوپڑی پر سواری کریں گے۔

لیجئے مدیر تجلّی آگئے۔ اسٹیشن پر بھیڑ بہت تھی۔ میں ان کا دیدار تو کر سکا مگر دست بوسی کی نوبت نہیں آئی کیونکہ چنو ایک کاندھے پر تھے اور منو دوسرے پر۔ ٹنو گردن میں باہیں حمائل کئے کمر پر اس طرح لٹکے ہوئے تھے کہ ان کے پیروں کی قینچی میرے پیٹ کو کس رہی تھی۔ کھنو ٹھنک رہے تھے کہ ہمیں بھی سوار کرائو۔ اب دُم تو تھی نہیں کہ انھیں اس میں باندھ لیتا بمشکل تمام ایک بغل میں سنبھالا۔ چھ اور ہیں جو ذرا بڑے ہیں۔ گیٹ کیپر سمجھ رہا ہے کہ یہ سب میرے ہی شہزادے ہیں۔ چبا چبا کر ہنس رہا ہے۔ اب مرتا کھپتا میں مدیر تجلّی تک پہنچا مگر انھوں نے ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر دوسری طرف رُخ پھیر لیا۔ بقول غالب:۔

مرے دل سے کوئی پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو

تاہم اگلے دن مغرب پڑھ کر وہ غریب خانے پر تشریف لائے۔ ضروری نہیں کہ مغرب پڑھی ہی ہو۔ اپنے حاجی تمنّا تو جب سے حج کر کے آئے ہیں نماز کی چھٹی ہی کر دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حدیث کی رو سے حاجی اس بچے کی طرح ہو جاتا ہے جسے ابھی ابھی اس کی ماں نے جنم دیا ہو۔ بچوں پر نماز فرض نہیں۔ جب حج پر بارہ برس گذر جائیں گے تو عمرِ بلوغ شروع ہوگی۔ یہ استدلال سُن کر مولوی بدیع الزماں بہت سٹپٹائے تھے۔ نہ تو حدیث کا انکار کر سکتے ہیں نہ عمرِ بلوغ دو سال بتا سکتے ہیں۔ پھر کیا توڑ کریں۔ توڑ نہیں کر سکے تو خود بھی نماز چھوڑ دی کیونکہ ان کے حج کو بھی ابھی فقط پانچ ہی سال گذرے تھے۔

"کہو میاں کچھ لکھا؟" مدیر تجلّی نے پوچھا۔

"کافی لکھا ـــ مگر موضوع اس بار ایسا ہے کہ آپکو دُکھ ہوگا ـــ"

"مجھے سوائے دکھ کے تم نے سُکھ کب دیا ہے ـــ لاؤ دکھاؤ کیا جھک ماری ہے ـــ"

میں سارا مواد سمیٹ لایا۔

"یہ دیکھئے ـــ مولانا مودودی کی تازہ کتاب خلافت و ملوکیت ـــ اسے بعض لوگ یکتائے روزگار قرار دیتے ہیں ـــ"

"وہ تو دیتے ہیں ـــ آگے کہو۔"

"یہ ہفت روزہ الجمعیۃ کے متعدد شمارے ملاحظہ فرمائیے آپ جانتے ہی ہوں گے کہ اسے سلطان القلم، ارسطوئے دوراں، رئیس القرطاس، فقیہہ العصر جناب وحید الدین خاں صاحب مرتب فرماتے ہیں۔ اس میں ان کے چند در چند

مضامین ملاحظہ فرمائیے اور پھر خلافت وملوکیت کھولیئے۔ مولانا مودودی نے ایک دو جگہ نہیں دسیوں مقامات پر اپنی کتاب میں جناب خاں صاحب کی لمبی لمبی عبارتیں جوں کی توں چوری کر لی ہیں ـــــ جی ہاں جوں کی توں۔ حرف بحرف شوشہ بہ شوشہ ـــــ"

میں نے فخر کے ساتھ سینہ پھلایا۔ میری نظریں طنز کے نشتر لئے ان کے چہرے پر خجالت اور پریشانی کے آثار ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ مولانا مودودی کے پرانے قصیدہ خوانوں میں ہیں۔ ان سے زیادہ کسے اس انکشاف پر ندامت ہو سکتی تھی کہ جس پر وہ جان چھڑکتے تھے وہ تو نرا چور نکلا۔

مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی جب ان کے چہرے پر صدمے اور شرم کے عوض تبسم کی چاندنی سی پھیلی نظر آئی۔ انھوں نے ہونٹ اس طرح بھینچے جیسے بے اختیار اُبلنے والی مسکراہٹ کو دانتوں سے کچل رہے ہوں۔ پھر بھووں پر زور ڈال کر چہرے پر خشکی پیدا کی۔ پھر کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا اور کہنے لگے:۔

"کیا تم افیم بھی کھانے لگے ہو ـــــ"

"ابھی تک تو نہیں کھائی ـــــ آپ حکم دیں گے تو یہ بھی کرنا ہوگا ـــــ حکم کا غلام جو ٹھیرا۔"

"تم خوش ہو رہے ہو گے کہ وحید الدین خاں کی چوری پکڑ کر تم نے بڑا تیر مارا ہے ـــــ حالانکہ اس کی توقع میں بہت پہلے سے رکھتا ہوں۔"

"وحید الدین خاں کی چوری ـــــ" میں نے اعتراض کیا ـــــ "یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ خلافت و ملوکیت تو ابھی چند روز ہوئے شائع ہوئی ہے الجمعیۃ پچاس سالوں سے نکل رہا ہے یہ دیکھئے۔ جلد ۵۲ اور ۵۳ ـــــ"

"یہ کیا دلیل ہوئی!"

"میرا مطلب ہے کہ وحید الدین خاں صاحب جو عبارتیں پچھلے سال الجمعیۃ میں لکھ چکے ہیں وہی جب سالِ رواں میں مولانا مودودی کی کتاب میں آگئیں تو چور وحید الدین خاں کیسے ہوئے۔ چوری تو ظاہر ہے مولانا مودودی ہی کی مانی جائے گی ـــــ"

"تم مجھ سے بھی ٹھٹول کرتے ہو ـــــ یوں کہو سارا وقت گدھے پن میں برباد کرتے رہے ہو۔ نہ جانے کب بچپن جائے گا۔"

اتنے میں ملائن چائے کی ٹرے سجا لائی۔ وہ کنکھیوں سے مجھے دیکھ دیکھ کر مسکرا بھی رہی تھی۔

"آپ کے سامنے میں زبان تو نہیں چلا سکتا۔" میں نے جھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا ـــــ "مگر یہ بات واقعی میری سمجھ میں نہیں آئی کہ چور میرے خاں صاحب کیسے ہو گئے۔ خلافت وملوکیت تو کل کی تصنیف ہے۔"

"میرے خاں صاحب! ـــــ کبھی ملے بھی ہو ان سے۔"

"کئی بار ـــــ یہ الگ بات ہے کہ یہ ملاقاتیں بس خوابوں تک محدود رہی ہوں۔"

"اچھا بس بکواس بند کرو ـــــ نسیمہ تجھے میں سلیقہ مند سمجھا کرتا تھا ـــــ تو اگر سلیقے سے کام لیتی تو اس گدھے کی زندگی یوں برباد نہ ہوتی ـــــ"

"بھیا۔ میں۔۔۔۔ میں ـــــ"

"کیا میں میں ـــــ ذرا سختی سے کام لے تو اسکی اصلاح اب بھی ناممکن نہیں ہے۔ مگر تو کیا اصلاح کرے گی تجھے تو خود اس کی حماقتوں میں مزا آنے لگا ہے۔"

میری ایڑی سے شعلہ لپکا اور کھوپڑی کی بالائی چھت سے ٹکرا کر پھلجھڑی میں تبدیل ہو گیا ـــــ ذرا دیکھئے۔ شوہر کے بارے میں اس کی بیوی کو درس دیا جا رہا ہے کہ ذرا سختی سے کام لے ـــــ پھٹ گئی ہوتی زمین ـــــ گر پڑا ہوتا آسمان۔

خدایا تو کہاں ہے کیا ہوئی تیری غضبناکی

جب چائے پی چکے تو فرمانے لگے:۔

"اس چوری کے موضوع پر میں خود لکھوں گا۔ تم یہ پرچے میرے پاس پہنچا دینا ـــــ"

"جیسا آپ کا حکم ہو ـــــ تاہم یہ نکتہ ضرور سمجھاتے جائیے کہ چور مولانا مودودی کیوں نہیں ہیں؟"

"میرے پاس برباد کرنے کے لئے وقت نہیں۔ تم نے نسیمہ کو بھی پاگل بنا دیا ہے وہی تم سے سر مارے گی۔"

"بھیا ــ حج کی تو کچھ باتیں سنا دیجئے ــ" ملائن نے ڈرتے ڈرتے فرمائش کی۔

"بس اپنا کام کرو ــ باتیں کیا سنا دوں سب حج کرتے ہیں۔ میں بھی کر آیا ــ"

"فرعون کا بُت تو آپ نے قاہرہ کے اسٹیشن پر ضرور دیکھا ہوگا ــ" میں نے پُر شوق لہجے میں سوال کیا۔ انھوں نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا۔

"اب اس کے سوا تمھارا کوئی علاج نہیں رہا ہے کہ کسی ڈاکٹر سے تمھارے دماغ کا آپریشن کرا دیا جائے ــ نالائق کہیں کے ــ"

پھر وہ چلے گئے تو ملائن مجھ سے اُلجھ پڑی۔

"ہائے اللہ ــ آپ بھی ذرا نہیں سوچتے۔ قاہرہ حج میں کہاں سے نکل آیا ــ"

"کیوں نہیں نکل آیا ــ حاجی بُندے جب حج کو گئے تھے تو جدّے سے اگلا اسٹیشن قاہرہ ہی پڑا تھا۔ بلکہ وہ تو یہ بھی بتا رہے تھے کہ جمال عبد الناصر کو انھوں نے بینچ پر بیٹھے دیکھا تھا ــ"

"مجھے آپ پاگل بناتے ہیں اور بھیا کہتے ہیں سلیقہ نہیں سیکھتی ــ"

"ہاں ہاں ــ تو کر دسختی ــ اٹھا لاؤ ڈنڈا ــ تمھارے بھیا تو اس لائق ہیں کہ میں اگر جمال عبد الناصر ہوتا تو پھانسی چڑھا دیتا ــ بنتے ہیں حاجی ــ پتہ نہیں کہاں تک جا کر لوٹ آئے ہوں گے ــ"

"وہ تو کہیں سے بھی لوٹ آئے ہوں۔ مگر آپ تو فلک ہفتم سے اُتریئے ــ حد ہو گئی ــ مولانا مودودی ہی کو آپ نے چور کہہ دیا ــ بھیا کو غصہ آجاتا تو پھر ــ"

"سچ تو کڑوا ہی ہوتا ہے ــ چلو تمھی ثابت کرو کہ وہ چور نہیں ہیں ــ میں سب سمجھتا ہوں تم خود بھی مودودیت کی زلف گرہ گیر میں اسیر ہو ــ"

"ثابت شدہ کو کیا ثابت کروں ــ چور ہیں وحید الدین خاں۔ آپ خوابوں کے دھوکے میں آگئے ــ"

"میرے خوابوں پر تبصرے کا تمھیں کوئی حق نہیں۔ تم کیا جانو میں کیسے کیسے خواب دیکھتا ہوں ــ"

"قوالی اور عرس کے دیکھتے ہوں گے ــ بلّی کے خواب میں چھیچھڑے ــ"

"ایسے موقع پر بقول شخصے کہا کرتے ہیں ــ ہاں تو موضوع سے مت بھاگو ــ خلافت و ملوکیت کل چھپی ہے۔ الجمعیۃ بہت پرانا ہے ــ"

"روزنامہ الجمعیۃ ــ یہ وحید الدین خاں والا ہفت روزہ ایڈیشن تو پرانا نہیں۔ اسے پیدا ہوئے ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا ــ"

"چلو مان لیا ــ مگر خلافت و ملوکیت تو فقط دو مہینے ہوئے لکھی گئی ہے ــ"

"آپ سے کس نے کہہ دیا؟"

"کلید الدین خاں کہہ رہے تھے۔ وہ وحید الدین خاں کے ہم زلف ہیں ــ"

"کیسے ہوئے ہم زلف۔ ان کی اہلیہ تو اپنے ماں باپ کی اکلوتی ہیں ــ"

"سطحی باتیں کرتی ہو ــ ہم زلفی کا ایک سائنٹفک طریقہ بھی ہے۔ سمندر پار سے ایک ثقافتی کلچرل وفد ہندوستان آیا تھا۔ اس کی قیادت ناصرہ نامی ایک عالمی رقاصہ کر رہی تھی اسی کی زلفوں میں دونوں بیک وقت اسیر ہوئے ــ بس ہو گئے ہم زلف ــ اسے معروضی نقطۂ نظر کہتے ہیں ــ نوٹ کر لو ــ"

"خیر کہتے ہوں گے ــ یہ خلافت و ملوکیت کا صفحہ دو ملاحظہ فرمایئے ــ مجھے کیا تک رہے ہیں۔ اسے دیکھئے۔"

اس نے صفحہ میرے سامنے کھول دیا۔ مارے گئے ــ وہاں تو پہلی اشاعت اکتوبر ۶۶ء کی لکھی ہوئی تھی۔

"بالکل بکواس ــ یہ تاریخ غلط چھاپ دی گئی ہے۔ ــ بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ کلید الدین خاں اور جھوٹ ــ"

"اب آپ دھاندلی پر اُتر آئے ــ دلیل کو دلیل سے کاٹیے ــ"

"میں سب سے پہلے اپنی گردن ہی جو کاٹ لوں گا۔ جتنے دغاباز ہیں میری ہی قسمت میں لکھے گئے ہیں۔ مجھے کیا خبر تھی کتاب تاریخ اشاعت بھی چھپی ہوئی ہے۔ کہنے لگے کہ ابھی دو مہینے ہوئے شائع ہوئی ہے۔ واقعہ اگر یوں ہی ہوتا تو مولانا مودودی کے چور ہونے میں کیا شک رہ گیا تھا۔ لعنت ہے اس دنیا پر۔ مولانا اب تو اپنے یہاں بلا ہی لے۔ جی اُکتا گیا ہے اس ناپاک دنیا سے۔" (ملازندہ صحبت باقی)

روغن اکسیر دماغ

دماغی قوت اور بالوں کیلئے بہترین ٹانک ہے۔
یہ تیل دماغ کو قوت دینے کے علاوہ بہت سے دماغی امراض اور نزلے میں بھی فائدہ مند ہے۔
بازار میں بے شمار قسم کے تیل دستیاب ہیں۔ مگر اکسیر دماغ اپنا جواب آپ ہے۔
دماغی محنت کا کام کرنے والوں کیلئے خاص تحفہ۔
قیمت ـــ ۱/۸۷ (علاوہ محصول ڈاک)

تعریف کرنے والوں کے چند نام

● مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ ● مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند ● مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی۔ ● مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی ● مولانا عامر عثمانی (مدیر تجلی) ● میجر ڈاکٹر اکرام علی صاحب ● استاذ الاطباء مولانا حکیم سید محفوظ علی صاحبؒ۔

ملنے کا پتہ

ہلال فارمیسی۔ دیوبند (یوپی)

منشی اینڈ کمپنی

کُل ہند روڈ ٹرانسپورٹ

فلیٹ آرنرس گورنمنٹ ملٹری اینڈ جنرل ٹرانسپورٹ کنٹریکٹرس اینڈ کمیشن ایجنٹس 84.C محمد علی روڈ بمبئی ۳
گرامس:- "LORRYMAN"
فون:- 324842 اور 325529

ڈلیوری آفس 25.H محمد علی روڈ۔ بمبئی ۳

ہماری شاخیں اور ان کے پتے

شکروار پیٹھ۔ پونا شہر۔
فون 56044

بمبئی اوکٹروئی ناکہ۔ ناسک

ٹاٹا اسکول روڈ۔ نوسری
فون 231

اسٹیشن روڈ۔ دہلی گیٹ۔ سورت
فون 848 ـــ 2549

پٹیل کالونی۔ اُدھنا
فون 86

ریلیف روڈ۔ ذکریا مسجد۔ احمد آباد
فون 20817

مچھی پیٹھ۔ راؤپورہ۔ نزد بڑودا ریڈیو اسٹیشن۔ بڑودا

مستقل عنوان

عامر عثمانی

کھرے کھوٹے

چار علمی مقالات

مقالہ نگار :- مولانا سعید احمد اکبر آبادی - صدر شعبہ سُنّی دینیات -
شائع کردہ :- علی گڑھ مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ -
سائز ۲۶ × ۲۰ صفحات ۱۰۲ -
قیمت درج نہیں - کاسفید - کتابت وطباعت روشن -

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے "منشورات دینیات فیکلٹی" کے عنوان سے کتابوں کی اشاعت کا ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے جس کی پہلی کتاب "تجارتی سود" پر ہم گذشتہ (بابت جنوری و فروری ۶۸ء) شمارے میں تبصرہ کر چکے ہیں - یہ اس سلسلے کی دوسری کتاب ہے - اس کے چاروں ہی مقالات مختلف سالوں میں چھپ چکے ہیں -

پہلا مقالہ "الصابون" کے عنوان سے ہے - قرآن کی سورۂ بقرہ میں یہود و نصاریٰ ہی کی طرح ایک گروہ صابیین کا تذکرہ کیا گیا ہے - فاضل مقالہ نگار نے اس مقالے میں شرح و بسط کے ساتھ یہ بتانے کی سعی مشکور کی ہے کہ صابیین سے کون لوگ مراد ہیں - انداز محققانہ اور مراد وزندار ہے - سب سے زیادہ مسرت ہمیں یہ دیکھ کر ہوئی کہ موصوف نے متذکرہ آیت کی تفسیر میں بعض ان نئے مفسرین کی پیروی نہیں کی جن کی تفسیر کرم کی قبائے زرّیں "وحدتِ ادیان" کے فرقِ زرنگار پر بھی اسیطرح چست آجاتی ہے جیسے اسلام کے تنِ مبارک پر - اس کے بجائے انھوں نے اللہ اور یوم آخر پر ایمان لانے کا مطلب وہی لیا جس پر معتمد اور ثقہ مفسرین کا اجماع ہے یعنی دعوتِ محمدی قبول کرنا - الحمد للہ علیٰ ذلک - دراصل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے اداروں کے عالی مقام اربابِ دانش سے ڈر ہی لگا رہتا ہے کہ وہ نہ جانے کب کس آیت یا حدیث کی کیا تعبیر پیش فرما دیں -

دوسرا مقالہ "الاُمّیون" ہے - قرآن نے دو آیات میں حضور خاتم الانبیاءؐ کو "النبی الامّی" کے لقب سے یاد فرمایا ہے اور جس قوم میں آپ کی بعثت ہوئی اُس کے لئے "اُمّیین" کا لفظ استعمال کیا ہے - فاضل مقالہ نگار نے اس مقالے میں عالمانہ اسلوب کے ساتھ لفظ امّی کے مصداق و مفہوم پر داد تحقیق دی ہے - اُمّی کے معروف معنی اُردو میں "ان پڑھ" لئے جاتے ہیں اور اُمت کا سوادِ اعظم النبی الامّی کا مطلب یہی سمجھتا ہے کہ ایسا نبی جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا - چنانچہ جمہور امت کے یہاں بطور عقیدہ یہ بات مانی جاتی ہے کہ حضورؐ کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا -

موصوف نے بڑی کاوش اور دلائل و براہین کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ امّی کا یہ مفہوم لینا درست نہیں -

گو کہ ہم ان کے تمام مثبت و منفی دلائل کے باوجود اس خیال سے اتفاق نہ کر سکے کہ حضورؐ لکھنا پڑھنا جانتے تھے لیکن یہ اعتراف نہ کرنا حق تلفی ہوگا کہ ان کے دلائل عالمانہ بھی ہیں اور اتنے قوی بھی کہ اگر ان کی بنیاد پر وہ عقیدۂ عام کو درست نہیں سمجھتے تو انھیں موردِ الزام نہیں ٹھیرایا جاسکتا۔ خصوصاً جب وہ مقالے کے اختتام پر کھل کر یہ بات کہتے ہیں کہ :-

> "اس مضمون میں صرف امی اور امیون کے صحیح معنی و مفہوم کو متعین اور ثابت کرنیکی کوشش کی گئی ہے اور بس۔ رہی یہ بات کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھنا پڑھنا آتا تھا یا نہیں؟ ہم کو نہ اس پر اصرار ہے اور نہ اس سے انکار۔"

تو پھر یہ فیصلہ بھی درست نہ ہوگا کہ وہ عقیدۂ عام کو رد ہی کرنے کے درپے ہیں۔ ویسے رجحان ان کا واضح طور پر یہی ہے کہ حضورؐ کو لکھنا پڑھنا کسی نہ کسی درجے میں ضرور آتا تھا لیکن ایسا رجحان گناہ نہیں ہے کیونکہ اس کے عقب میں علمی دلائل ہیں اس لئے ہم اس تفصیلی بحث میں پڑنا یہاں ضروری خیال نہیں کرتے کہ ان کے دلائل و براہین کو وقیع اور علمی تسلیم کرنے کے باوجود ہم کیوں ان کے خیال سے خود کو متفق نہیں کر سکے۔ نیز یہ بھی عرض کر دیں کہ لفظ امیین کی جو تفسیر و تعبیر انھوں نے پیش کی ہے وہ ہمارے خیال میں درست ہے۔ پھر بھی حضورؐ کا پڑھنے لکھنے سے واقف ہونا ضروری نہیں کہ ثابت بھی ہو۔ اپنے اختلافِ رائے سے قطع نظر کرتے ہوئے ہم بلا تکلف اعتراف کرتے ہیں کہ مقالہ اپنے موضوع پر جاندار اور وزنی ہے۔

تیسرے مقالے کا عنوان ہے "آٹھویں صدی ہجری کے اندلسی شعراء کا ایک تذکرہ" یہ موصوف کے شوقِ مطالعہ اور ذوقِ تحقیق کا ایسا نمونہ ہے جس پر ناقدانہ اظہارِ خیال ہم سے بہتر قابلیت کے حضرات کر سکتے ہیں۔ ہمیں اکیڈمک انداز کے تحقیقاتی کام سے کبھی واسطہ ہی نہیں پڑا پھر تبصرہ کیا کریں۔ بظاہر مقالہ بہت اچھا ہے۔ مگر عوام کے مطلب کا نہیں۔ عربی عبارتوں اور شعروں کے ترجمے نہیں دیئے گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خود مقالہ نگار بھی اسے بس اہل علم تک ہی محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ پھر تو شاید ہمارے تبصرے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔

چوتھا مقالہ ہے۔ "مالک ابن نویرہ کا واقعہ اور حضرت خالد بن ولیدؓ" یہ مقالہ ہمارے نزدیک اپنے افادی پہلو کے اعتبار سے باقی سب مقالوں پر بھاری ہے۔ باقی مقالات علمی و تحقیقی بے شک ہیں۔ لیکن وہ افادیتِ عامہ ان میں نہیں جو اس آخری مقالے میں ہے تاریخ کے جن دو مشہور واقعات نے صحابیِ جلیل حضرت خالد بن ولیدؓ کی عظمت و تقدیس پر غبار اڑایا ہے ان میں سے ایک یہی واقعہ ہے جس پر فاضل مقالہ نگار نے قلم اٹھایا ہے۔ ہم انھیں مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے اپنے فہم و فراست اور علم و تفقہ کی رشک انگیز صلاحیتوں کو ایک مفید و مبارک موضوع پر صرف کیا ہے اور خالد بن ولیدؓ کے دامنِ صافی سے بدگمانی کا وہ دھبہ دور کرنے میں وہ کامیاب ہیں جو روایات کی غلط ترتیب اور تاریخی مواد کے خلط نے پیدا کر دیا تھا۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔ ہم اگر یہ کتاب چھاپتے تو اس آخری مقالے کو شروع میں رکھتے کیونکہ ہماری نگاہ میں خالی علمی و تحقیقی اور اکیڈمک نوع کی تحریروں سے ان تحریروں کی قیمت زیادہ ہے جو علم و تحقیق سے زیور سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاحِ عقائد اور تصفیۂ خیال کا جوہر بھی اپنے اندر رکھتی ہوں۔

خلاصۂ تبصرے کا یہ ہے کہ اس کتاب نے علمی و تحقیقی کتابوں کے ذخیرے میں ایک وقیع اضافہ کیا ہے۔ ریسرچ حق تبصرہ ادا نہ ہوگا اگر بعض وہ خیالات بھی ہم پیش نہ کر دیں جو دورانِ مطالعہ میں ضمناً پیدا ہوئے۔

ایک یہ کہ آیات ہر جگہ بغیر اعراب لکھی گئی ہیں۔

یہ بات ہمیں پسند نہیں اور ہم چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی اسے پسند نہ کریں۔

دوسرے یہ کہ کسی صحابی کے نام پر رضی اللہ عنہ کی علامت (رض) دینے کا لحاظ نہیں کیا گیا حتیٰ کہ آخری مقالے کے عنوان ہی میں حضرت خالدؓ کا نام نامی موجود ہے مگر معروف نشانِ تعظیم سے خالی۔ پھر مقالے کا پہلا ہی فقرہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے اسم گرامی سے شروع ہوتا ہے لیکن اس پر بھی علامت تعظیم نہیں۔ ایسا ہونا ہمارے خیال میں مناسب نہیں ہے۔ یہ درست کہ جن مضامین میں بار بار صحابہؓ کے نام آئیں ان میں ہر نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ یا اس کے مخفف کا التزام دشوار ہی ہے اسی لئے ضروری بھی نہیں مگر سرے سے کہیں یہ نظر ہی نہ آئے تو اسے ہم پسندیدہ نہ کہہ سکیں گے۔

تیسرے حضرت خالد بن ولیدؓ اور حضرت عمرؓ کے لئے "تشدد پسند" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کی جگہ اگر "سخت گیر" جیسے کسی لفظ پر اکتفا کیا جاتا تو شاید اولیٰ ہوتا۔ غلط نہیں ہے کہ ان دونوں ہی وقیع المرتبہ صحابیوں کے مزاج میں اپنے اپنے انداز کی سخت گیری اور تشدد پسندی موجود تھی۔ مگر ہمارے زمانے میں "تشدد" کا لفظ عموماً ایسی بے رحمانہ قساوت کے مفہوم میں رواج پا گیا ہے جو ظالمانہ بھی ہو اور شقاوت و سنگدلی سے بھی خالی نہ ہو — یہ مذموم اوصاف چاہے لفظِ تشدد کی وضع اور لغوی معنی میں شامل نہ ہوں لیکن جب رواجاً یہ ایسے ہی سیاق و سباق میں بولا جاتا ہے تو کیا حرج تھا اگر صحابہؓ کے سلسلے میں اس سے اجتناب کر لیا جاتا۔ ھذا ما عندی والعلم عند اللہ۔

ماہنامہ مریخ (پٹنہ)

مدیر:- عبد المغنی ● صفحات ۸۰ - کاغذ سفید
● فی پرچہ ایک روپیہ ● پتہ:- لال باغ - پٹنہ ۶
جناب عبد المغنی ایک جانے پہچانے صاحبِ قلم ہیں، جن کے سنجیدہ مقالات اور وقیع نقد پاروں سے لکھا پڑھا حلقہ ناواقف نہیں ہے۔ خوبی یہ ہے کہ اندازِ فکر کے اعتبار سے وہ اسلام پسند ہیں اور اخلاقی قدریں انھیں بیحد عزیز ہیں۔ اس خوبی کا قدرتی ثمرہ یہ ہونا ہی چاہیئے تھا کہ ان کی ادارت میں جو بھی پرچہ نکلے وہ صالح اقدار کا نقیب اور پاکیزہ ادب کا امین ہو۔ مریخ کے چار شمارے آچکے ہیں۔ ان سب میں فاضل مدیر کے شستہ مذاق و مزاج کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ مضامین جاندار، منظومات دل کش۔ افسانے فکر انگیز۔

مریخ کا ادارۂ تحریر چار افراد پر مشتمل ہے:-
قمر اعظم ہاشمی۔ سید نذر امام۔ محمد یونس۔
احمد یوسف۔

سرپرستی جناب ڈاکٹر اختر اورینوی فرما رہے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ اربابِ علم و فکر کی یہ ٹیم مریخ کو بہتر سے بہتر بنانے کی سعی مشکور کرے گی۔ پاکیزہ ادب اور لٹریری مضامین کے شائقین سے ہماری گذارش ہے کہ وہ مریخ سے تعاون فرمائیں اور اس کی اسیع اشاعت میں حصہ لیں۔

عطر روحِ چمن

دلنواز اور پُر کیف خوشبو، دیر تک رہنے والی —
ایک تولہ - بارہ روپے ● چھ ماشہ - ساڑھے چھ روپے
● تین ماشے - ساڑھے تین روپے ● ڈیڑھ ماشہ - دو روپے -

گلزار سینٹ

نسبتاً ہلکی خوشبو - فرحت بخش اور روح پرور -
ایک تولہ - دس روپے ● چھ ماشہ - ساڑھے پانچ روپے
● تین ماشے - تین روپے
● ڈیڑھ ماشہ - ڈیڑھ روپیہ

دار الفیض رحمانی - دیوبند (یو-پی)

آپ کی لائبریری میں ان اہم کتابوں کا ہونا بیحد ضروری ہے

تاریخ ابن خلدون

یہی وہ تاریخ ہے جس کے صرف مقدمے ہی نے اس کے مؤلف کو ساری دنیا میں مشہور کر دیا۔ ابن خلدون کا نام مشرق ہی میں نہیں مغرب میں بھی بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ اس کی مرتب کردہ یہ مشہور زمانہ تاریخ آج آپ کو اُردو لباس میں دستیاب ہو سکتی ہے۔

مقدمہ تاریخ ابن خلدون — پندرہ روپے ۱۵/-
تاریخ قبل از اسلام دو جلد — اکیس روپے ۲۱/-
مکمل ابن خلدون — درسات جلد ۹۲/۹۰

زاد المعاد

امام ابن تیمیہؒ کے شاگرد رشید علامہ ابن القیم کی یہ کتاب سیرتِ رسولؐ اور اس کے متعلقہ گوشوں پر دنیا کی معیاری کتابوں میں شمار کی گئی ہے۔ علوم و معارف کا خزانہ۔ اس کا مکمل اُردو ترجمہ چار ضخیم جلدوں میں حاضرِ خدمت ہے۔ قیمت — چوالیس روپے پچھتر پیسے ۴۴/۷۵

مؤطا امام محمدؒ

ایک ہزار سے زائد احادیث کا وہ مستند ذخیرہ جسے امام محمدؒ نے امام مالکؒ سے روایت کیا۔ ترجمے اور فوائد کے ساتھ۔ قیمت — آٹھ روپے ۸/-

صحابۂ کرامؓ قرآن کریم میں

موضوع نام سے ظاہر ہے۔ سید نور الحسن بخاریؒ نے بڑی کاوش سے ان نصوص کو جمع کیا ہے جن سے تمام صحابہؓ کے مراتب و مناقب کا

آثار امام محمدؒ و امام ابو یوسفؒ

امام ابو حنیفہؒ کے ان دو جلیل القدر شاگردوں کے آثار و اخبار، حالات و سوانح اور مجتہدات و فتاویٰ۔ جو ساری دنیا میں خود بھی امام ہی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ اہلِ ذوق کیلئے یہ کتاب تحفۂ نادرہ ہے۔ ساڑھے تیرہ روپے ۱۳/۵۰

المنتقیٰ (اُردو)

ایک شیعہ عالم نے "منہاج الکرامۃ" کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس میں صحابہؓ کو گالیاں دینے کا ریکارڈ توڑ دیا گیا تھا۔ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے اپنے حیرت انگیز علم و تفقہ کی روشنی میں اسکا جواب لکھا جو "منہاج السنۃ" کے نام سے مشہور ہوا۔ مگر اس کی ضخامت بہت تھی اس لئے شیخ الاسلام کے شاگرد رشید ذہبیؒ نے المنتقیٰ کے نام سے اسکی تلخیص کی اور اسی تلخیص کا اُردو ترجمہ ہم آپ کو پیش کر رہے ہیں شیعہ سنی کے اختلافی مسائل پر یہ عظیم کتاب اپنا جواب نہیں رکھتی۔ قیمت مجلد — اکیس روپے ۲۱/-

التشرف معروف بہ احادیث التصوف

نام بجائے عربی میں ہے لیکن تصنیف اُردو ہی کی ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علیؒ نے اس جلیل القدر کتاب میں تصوف کی حقیقت، اس سے متعلقہ احادیث و مسائل اور تصوف کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے۔ قیمت۔ بارہ روپے ۱۲/-

مکتبہ تجلی - دیوبند (یو۔پی)

حضرت عمرو بن العاصؓ

اس اُولوالعزم اور بہادر سپہ سالار کی مفصل روداد حیات۔ جس نے تھوڑی سی فوج سے مصر کو فتح کیا تھا۔ جسے اللہ نے صحابیت کے شرف سے نوازا تھا اور جو دنیا بھر میں ایک اونچے مدبر اور سیاستداں کی حیثیت سے متعارف ہے۔ تالیف:۔ محمد فرج مصری۔ ترجمہ:۔ شیخ احمد پانی پتی
قیمت ـــــ بارہ روپے۔

تاریخ الخلفاء

حافظ جلال الدین سیوطیؒ کی مشہور و معروف کتاب جو اسلام کی تقریباً سو سالہ تاریخ پر مشتمل ہے۔ اُردو ترجمہ اقبال الدین احمد۔ قیمت ـــــ بارہ روپے۔

ابوبکر صدیقؓ اور فاروق اعظمؓ

ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے قلم سے۔ حضور اکرمؐ کے ان دو جانشینوں کا ایمان افروز تذکرہ جنھیں دنیا ابوبکرؓ و عمرؓ کے ناموں سے یاد کرتی ہے۔ مترجمہ:۔ شاہ حسن عطار۔
قیمت ـــــ چھ روپے ۷۵ پیسے۔

حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ

یہ بھی طٰہٰ حسین ہی کے موئے قلم کا نقش جمیل ہے۔ تاریخ اور سیاست کی روشنی میں تیسرے اور چوتھے خلیفہ کا ذکر مقدس۔ مترجمہ:۔ مولانا عبدالحمید نعمانی۔ پن بارہ روپے۔

الاحکام السلطانیہ

پانچویں صدی ہجری کے دقیقہ رس قانون داں الماوردی کی عظیم تصنیف جس میں سیاست، معاشیات اور فقہ اسلامی پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اُردو ترجمہ، رواں اور سلیس۔ قیمت ـــــ گیارہ روپے۔

تزکیۂ نفس

مولانا امین احسن کی معرکۃ الآراء تالیف۔ تزکیۂ نفس کی حقیقت اور وہ کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ جدید ایڈیشن۔ قیمت ـــــ چھ روپے۔

صحابیاتؓ

جن عورتوں کو خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کا شرف حاصل ہوا ان کے تاریخی حالات و واقعات۔ سات روپے ۷۵ پیسے

امیر تیمور

ماسکو سے دمشق اور دہلی سے انقرہ تک روند کرنے والے فاتح کی داستان جس کی ساری زندگی گھوڑے ہی کی پیٹھ پر گذری۔ ہیرلڈ لیمب نے بڑے تجسس سے اسکی سوانح مرتب کی ہے۔ اُردو ترجمہ از محمد عنایت اللہ دہلوی۔
قیمت ـــــ بارہ روپے۔

تاریخ فیروز شاہی

فیروز شاہ تغلق کی مکمل سوانح عمری اور اسکے پُرشکوہ دورِ حکومت کا تفصیلی تذکرہ جو اسی دور کے مؤلف کا قلمبند کیا ہوا ہے۔ قیمت ـــــ نو روپے۔

علم الکلام اور الکلام

علم کلام کی ابتداء، عہد بہ عہد اسکی ترقی اور تغیرات کی مفصل تاریخ اور علم کلام کے تمام شعبوں پر ناقدانہ کلام علامہ شبلی نعمانیؒ کے خامۂ زرنگار سے۔ دس روپے۔

حکایاتِ اولیاء

تالیف مولانا اشرف علیؒ۔ اس کتاب میں شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کے بزرگوں اور علمائے دیوبند کے اکابر علماء کی حکایات اور حالات و کوائف جمع کئے گئے ہیں۔ قیمت ـــــ چھ روپے۔

مسجد سے میخانے تک | تجلی میں شائع شدہ ملا ابن العرب مکی کے شہ پاروں کا انتخاب کتابی شکل میں۔ حصہ اوّل مجلّد پانچ روپے (حصہ دوم زیر کتابت)

مفردات القرآن | قرآنی الفاظ کی شرح و توضیح پر امام راغب کی وہ شہرۂ آفاق کتاب جو بڑی بڑی تفاسیر کے لئے بنیاد کا درجہ رکھتی ہے۔ اردو ترجمہ کیساتھ۔ قیمت چالیس روپے سستا ایڈیشن تیس روپے

اہل بیت اور اہل سنّت | اس فکر آفریں کتاب میں اہل سنت کی اُن غلطیوں کی نشاندہی کی گئی ہے جو اُن سے اہل بیت رسولؐ کے باب میں ہوئیں۔ قیمت ـــ ایک روپیہ ۱/-

طبِ نبویؐ | مختلف امراض اور حفظانِ صحت کیلئے احادیث میں جن داؤں اور جس طریقِ علاج کا ذکر آیا ہے اسے ماضی میں کتابی شکل دی گئی تھی۔ اب یہی کتاب زبان و بیان کے تازہ اسلوب کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ قیمت مجلّد ـــ دو روپے ۲/-

انتخاب صحاح ستّہ | حدیث کی چھ صحیح ترین کتابوں، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ کی مفید ترین حدیثوں کا مقبول و معروف انتخاب۔ قیمت ـــ پانچ روپے ۵/-

لطائفِ علمیہ | چھٹی صدی ہجری کے جلیل القدر فقیہہ و محدث علامہ ابن الجوزیؒ کی عجیب کتاب۔ کتاب الاذکیاء کا اردو ترجمہ۔ سات سو ایسے لطائف و قصص جن میں ذہانت و ذکاوت، حاضر جوابی، نکتہ سنجی، طنز و مزاح اور صنعتِ لفظی کے رنگا رنگ جلوے ملتے ہیں۔ قیمت ـــ پانچ روپے ۵/-

قافلۂ سخت جاں | از:- اسعد گیلانی

(نظر ثانی کیا ہوا تازہ ایڈیشن) جب جماعت اسلامی کے اراکین جیلوں میں بھر دیئے گئے اس وقت کی فکر انگیز کہانی تیکھے اور دل آویز انداز میں۔ قیمت ـــ چھ روپے ۶/-

مولانا مودودی سے ملیئے | مولانا مودودی کی شخصیت، ان کے علم و فضل، ان کی دعوت، ان کے مشن، ان کی پوری زندگی کے احوال و کوائف پر اسعد گیلانی کی ایک مبسوط کتاب، دنیا بھر کے علماء، اہل فکر اور اربابِ قلم کی آراء۔ قیمت ـــ ساڑھے چھ روپے ۶/۵۰

تلاشِ راہِ حق | از:- اسعد گیلانی۔

کی زبان میں ایک روداد۔
مولانا سید سلیمان ندویؒ۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ۔ مولانا منظور نعمانی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ میاں طفیل محمد۔ چودھری علی احمدؒ۔ دو روپے ۲/-

حکایاتِ جنوں | اور دوسرے افسانے

از:- اسعد گیلانی

قیمت ـــ دو روپے ۲/-

پکار | اسعد گیلانی کے چند مؤثر مضامین کا مجموعہ۔ قیمت ـــ ڈیڑھ روپیہ ۱/۵۰

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی | اسنیٔ علماء کی نظر میں قیمت ـــ ایک روپیہ۔

مولانا مودودی اور تصوّف | کہا جاتا ہے کہ مولانا مودودی تصوف کے دشمن ہیں۔ اس الزام کی پوست کندہ حقیقت خود مولانا کی اپنی تحریروں کے آئینے میں ملاحظہ فرمائیے۔ یہ کتاب آپکو بتائے گی کہ مولانا کس تصوف کے دشمن اور کس تصوف کے حامی ہیں۔ قیمت مجلّد ـــ دو روپے ۲/-

میلاد النبیؐ | حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش شریفہ کے متعلق مولانا اشرف علیؒ کے مبسوط اور سیر حاصل مواعظ کا مجموعہ۔ صفحات ۸۰۰ قیمت ـــ بارہ روپے ۱۲/-

مکتبہ تجلّی۔ دیوبند (یو۔پی)

تصانیف حافظ امام الدین رام نگری

	پیسے	روپے
ابوبکر صدیقؓ (سوانح اور حالات)	۰	۲
آواگون کا تحقیقی جائزہ	۷۵	۱
انوار اسلام بجواب مصابیح الاسلام مکمل	۰	۵
افاضات سورۂ یٰسین	۰	۱
اُردو ہندی ماسٹر	۵۰	۰
ابوایوب انصاریؓ (میزبانِ رسولؐ)	۶۲	۰
بے مثال زندگی	۶۵	۰
جزیہ کی حقیقت	۵۸	۰
حضرت فاطمہ زہرہؓ	۸۰	۰
حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ	۷۵	۰
حضرت عثمانؓ ذی النورین	۸۸	۰
خاصانِ خدا کا خوفِ آخرت ہر دو حصہ	۷۵	۰
خاصانِ خدا کی نمازیں	۹۵	۰
دلائل القرآن مکمل ہر چہار حصہ	۱۰	۴
رسالتِ محمدیؐ کے عقلی دلائل	۰	۱
رحمانی تبصرے کا جائزہ	۳۷	۰
سفرائے اسلام	۷۵	۰
عقیدۂ رسالت اور اوتار مکمل	۰	۶
عقیدۂ آخرت کے عقلی دلائل	۸۰	۰
عقیدۂ نجات کا جائزہ	۰	۱
علمبردارانِ اسلام	۰	۱
نماز کے فضائل	۰	۱
عقیدۂ توحید اور انسانیت	۶۰	۰
معلم نماز ہندی	۵۰	۰
معلم نماز اُردو	۵۰	۰
معیاری اسلامی حکومت	۲۵	۲
مسلمان شوہر و بیوی	۰	۱

تصانیف مولانا حامد علی صاحب

	پیسے	روپے
انجیلیں اور تثلیث	۸۰	۰
اسلام کا تصورِ توحید	۵۰	۰
احادیثِ رسولؐ ۱ ایمان باللہ	۵۰	۰
〃 〃 ۲ رسالتِ محمدیؐ	۰	۱
〃 〃 ۳ قرآن مجید	۵۰	۰
〃 〃 ۴ قیامت	۵۰	۰
تعدادِ ازدواج	۷۵	۱
توحید کے اثرات انسانی زندگی پر	۵۰	۰
توحید اور عہد نامۂ عتیق	۴۰	۰
تعلیم کا مسئلہ	۴۰	۰
توحید کے عملی تقاضے	۵۰	۰
توریت کے جواہر پارے	۵۰	۰
اسرائیل اور اس کا فتنہ	۰	۱
حج کیا ہے؟	۵۰	۰
خدا پرستی ملحدین کی نظر میں	۴۰	۰
خدا کا انکار کیوں؟	۴۰	۰
خدا ہے؟!	۴۰	۰
سکھ مت اور توحید	۹۰	۰
شرک کے اثرات انسانی زندگی پر	۴۰	۰
شرک عظیم ترین گمراہی	۴۰	۰
غلط فہمیوں کا ازالہ	۵۰	۰
قوموں کا عروج و زوال	۵۰	۰
کیا خدا کی ضرورت نہیں؟	۴۰	۰
گوشت خوری	۵۰	۰
مذاہب اور تخلیق کائنات	۵۰	۰
ملحدین کے شبہات	۴۰	۰
ہمارا دفاعی منصوبہ	۴۰	۰
یسوع مسیح انجیل کے آئینے میں	۸۰	۰
احادیثِ رسولؐ اللہ کی عدالت	۵۰	۰

تفسیر بیان القرآن — مولانا اشرف علیؒ کی مشہور زمانہ تفسیر مکمل و مجلد۔ قیمت — تریسٹھ روپے ۶۳/-

تفسیر حقانی — مولانا عبدالحق حقانی کی لاجواب تفسیر۔ مکمل و مجلد۔ قیمت — چونسٹھ روپے ۶۴/-

البیان فی علوم القرآن — یہ تفسیر حقانی ہی کا مقدمہ ہے مگر اپنی ضخامت اور وسعت کے اعتبار سے مستقل کتاب ہے۔ قیمت مجلد — سات روپے ۷/-

تفسیر ابن کثیر مکمل (اردو) — علامہ ابن کثیرؒ کی معرکۃ الآراء تفسیر، جو اب بتیس ۳۲ قسطوں میں مکمل ہو گئی ہے — فی قسط دو روپے۔
مکمل بلا جلد رعائتی قیمت — ساٹھ روپے ۶۰/-
مجلد ریگزین — پینسٹھ روپے ۶۵/-

دنیا و آخرت — مولانا اشرف علیؒ کے چند اثر انگیز مواعظ۔ جن کا موضوع نام سے ظاہر ہے۔ مکمل و مجلد قیمت — دس روپے ۱۰/-

حصن حصین — شب و روز کے تمام معمولات اور زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق حدیث سے منقول دعاؤں کا مشہور مجموعہ۔ عربی مع اردو۔ قیمت — دس روپے ۱۰/-

شاہ عبدالعزیز اور انکی تعلیمات — خاندان ولی اللہی کے روشن چراغ، علوم دینیہ کے امین، زہد و اتقاء کے پیکر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کمالات و اوصاف پر ایک عمدہ کتاب۔ اس میں آپ کے بلیغ ارشادات اور عملیات مجربہ وغیرہ بھی جمع کئے گئے ہیں۔ قیمت مجلد — چار روپے پچاس پیسے ۴/۵۰

معلم نماز — نماز سیکھنے کی عمدہ کتاب۔ اردو پچاس پیسے ۵۰/- ہندی پچاس پیسے ۵۰/-

احکام رب ذوالجلال — قرآنی آیات کا انتخاب معترجمہ قیمت — سوا روپیہ ۱/۲۵

تذکرہ علمائے ہند — مؤلفہ:- جناب مولوی رحمان علی۔ مرتبہ و مترجمہ:- جناب محمد ایوب قادری — سات سو سے زائد صفحات کی یہ بیش قیمت لٹریری کتاب، تذکرہ نگاری کے باب میں ایک شاندار اضافہ کرتی ہے۔ تحقیق، تلاش اور عرق ریزی و کاوش کا شاہکار۔ قیمت مجلد — پندرہ روپے ۱۵/-

کیا جماعت اسلامی حق پر ہے؟ — دنیا بھر کے علماء و فضلاء کے فتوے اور فیصلے۔ ایک اہم کتاب جو مخالف و موافق ہر ایک کیلئے مفید اور دلچسپ ہے۔ قیمت — تین روپے۔

اسلام کا نظام امن — اسلام کی پاکیزہ ترین اصطلاح "جہاد" کی آڑ لیکر اسلام کے دشمنوں نے بدامنی، فتنہ انگیزی، خوں آشامی اور انتقام پسندی کے جو الزامات اسلام کے خلاف گھڑے ہیں ان سب کا تسلی بخش جواب قرآن و سنت اور واقعات و حقائق کی روشنی میں۔ قیمت — آٹھ روپے (مجلد ساڑھے نو روپے) ۸/- (۹/۵۰)

ہزار سال پہلے — ہندو پاک، چین اور مسلمان مملکتوں کے تہذیبی و تمدنی حالات۔ جن کا مشاہدہ چوتھی اور پانچویں صدی کے سیاحوں نے کیا اور انھیں اپنی تحریروں میں محفوظ کر دیا۔ فاضل مؤلف مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے قلم نے دلچسپ احوال و وقائع کو دلچسپ تر بنا دیا ہے۔ قیمت — چار روپے ۴/-

الہارون — اس مشہور بادشاہ کا تذکرہ جسے "بادشاہوں کا بادشاہ" کہا جاتا ہے۔
تالیف:- عمر ابو النصر۔ ترجمہ:- شیخ محمد احمد پانی پتی۔
قیمت — سوا دو روپے ۲/۲۵

اصلاح الرسوم — مسلمانوں میں جو فضول رسمیں رواج پا گئی ہیں ان کی تردید و مذمت میں مولانا اشرف علیؒ کی مشہور کتاب۔ قیمت مجلد۔ ایک روپیہ پچھتر پیسے ۱/۷۵

مکتبہ تجلی - دیوبند (یو۔پی)

اصلاح معاشرہ میں نماز کا مقام

"نماز کے موضوع پر بہت کتابیں ہیں لیکن اس کتاب کا امتیازی وصف یہ ہے کہ نماز کے علمی پہلوؤں کے بجائے اس میں عملی گوشوں پر گہری توجہ صرف کی گئی ہے۔ یہ گویا عملی تجربات کا قیمتی آئینہ ہے۔ نظر ثانی شدہ ایڈیشن سے فائدہ اٹھائیے۔ قیمت ۔ ڈیڑھ روپیہ ۱/۵۰

عالم اسلام اور یہودیت

موضوع نام سے ظاہر ہے۔ قرآن، حدیث، بائیبل وغیرہ کے قیمتی مواد کے علاوہ اس میں یہودیوں کے قومی منشور کی تفصیلات بھی ہیں۔ قیمت ـــ ایک روپیہ۔

مصر کے فرزندانِ توحید تختۂ دار پر

ان مظلوم داعیانِ حق کا تذکرہ جنھیں جمال عبد الناصر کے دورِ اقتدار میں لرزہ خیز اور بدترین مظالم کا تختۂ مشق بنایا گیا ہے۔ رحمہم اللہ۔ قیمت ـــ پچاس ۵۰ پیسے۔

مولانا محمد احسن نانوتوی

ایک ایسے بزرگ کا محققانہ تذکرہ جنھیں زمانہ بھلاتا جا رہا ہے۔ تذکرہ نگار جناب محمد ایوب قادری نے اپنے ذوقِ تلاش سلیقۂ ترتیب اور حسن بیان سے جو اعتماد اور حسنِ ظن لٹریری حلقوں میں پیدا کیا ہے اس میں یہ تذکرہ اضافہ کرتا ہے۔ قیمت ـــ چار روپے۔

کثرتِ آبادی کا علاج

اس کتابچے میں نعیم صدیقی بڑی متانت کے ساتھ اس مسئلے پر بحث کرتے ہیں کہ کثرت آبادی کا علاج نسل کشی ہے یا تلاش وسائل؟ ـــ خاندانی منصوبہ بندی کے فلک شگاف غل غپاڑے میں آپ ذرا علم و استدلال کا سنجیدہ نغمہ بھی سنئے۔ قیمت ـــ ۲۵ پیسے۔

مصر و یمن

ان دونوں ملکوں میں طاغوتی نظریات کی حامل قوتیں کیا کچھ کر رہی ہیں کسطرح تین لاکھ سے زائد مسلمان ذبح کئے جا چکے ہیں۔ کیسی تباہ کن صورت حال ہے جو اسلام کا نام لینے والوں نے پیدا کر دی ہے۔ قیمت ـــ چالیس ۴۰ پیسے

اسلامی قوانین کا اجراء

پاکستانی دستور میں پاکستان کو قرآن و سنت والے اسلام کی جولانگاہ بنانے کا اعلان اور وعدہ کیا گیا ہے۔ لیکن اس وعدے کا وہاں آج تک کیا حشر ہے ـــ اس کا جواب یہ کتابچہ دیتا ہے۔ قیمت صرف ۲۵ پیسے۔

مصر میں اسلام اور اشتراکیت کی کشمکش

ایک مختصر لیکن وقیع کتاب جو ہر اُس مسلمان کے لئے واجب المطالعہ ہے جسے دین اور اس کے تقاضوں اور اپنے دینی بھائیوں سے دلی محبت ہے۔ اخوان المسلمون کی لازوال قربانیوں کا حال بھی یہ کتاب آپ کو بتائے گی۔ پچاس ۵۰ پیسے۔

حضرت تھانویؒ اور اعلیٰ حضرت

حفظ الایمان پر کئے ہوئے اعتراضات کا جواب مکمل و مدلل اور دلنشیں طرز پر۔ اسی کے ساتھ بریلوی مذہب کی گھناؤنی تصویر اور ردِ بریلویت کے لئے مستحکم دستاویز۔ قیمت ـــ ایک روپیہ ۱/۵۰ پیسے۔

ایک اُبھرتے ہوئے شاعر عبد العزیز خالد کی

شعری تخلیقات

گل نغمہ (گیتا نجلی) چار روپے
سرود رفتہ (سیفو کے نغمے) چار روپے
غزل الغزلات (نغمۂ سلیمان) ایک روپیہ ۵ پیسے
کلکِ موج (افکار تازہ) سات روپے ۵۰ پیسے
دکانِ شیشہ گر (منظوم ڈرامے) پانچ روپے۔
کفِ دریا (نئی غزلیں) سات روپے۔
ورق ناخواندہ (منظوم ڈرامے) تین روپے۔
سلومی (مع ترجمہ) تین روپے ۵۰ پیسے

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)

سیاستِ شرعیہ

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کی شہرۂ آفاق کتاب کا ترجمہ۔ یہ نادر اور قدیم کتاب آپ کو بتائے گی کہ اسلامی شریعت میں سیاست کی کیا حیثیت ہے اور قرآن و سنت کی توضیحات اس باب میں کن تعلیمات پر مشتمل ہیں۔
قیمت مجلد ـــ آٹھ روپے ۲۵ پیسے

حضرت بابا فرید الدین گنج شکرؒ

ساتویں صدی ہجری کے مشہور ترین بزرگ کا مفصل تذکرہ جنھیں عوام و خواص گنج شکر کے نام سے یاد کرتے ہیں
قیمت ـــ چھ روپے۔

عرب کا چاند ایک تاریک غار میں

ندرت میرٹھی کے نعتیہ کلام کا دلآویز مجموعہ۔ ندرت اونچے درجے کے شاعر تھے۔ ان کے اشعار میں پختگی ہے۔ رچاؤ ہے۔ روانی اور بے ساختگی ہے۔ اہلِ ذوق لطف اٹھائیں۔ قیمت ـــ ایک روپیہ ۵۰ پیسے۔

الزامات کا جائزہ

ان الزامات کا منصفانہ جائزہ جو جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پر کبھی فتووں اور کبھی کتابچوں اور اشتہاروں کی شکل میں لگائے جاتے رہے ہیں۔ ڈھائی روپے۔

خزینۃ الاسرار

بیماری، مقدمہ، بے روزگاری، گھریلو جھگڑے، پریشانیاں، حادثات وغیرہ میں کام دینے والے نایاب خاندانی عملیات و تعویذات کا انمول ذخیرہ۔ آزمائے ہوئے روحانی نسخے زود اثر نقش۔ کارآمد زائچے۔ ہر خاص و عام اس قیمتی کتاب سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ قیمت صرف دو روپے

جامع اُردو لغات

اُردو مختلف زبانوں سے مل کر بنی ہے اس لئے اس میں عربی، فارسی، ہندی، ترکی سبھی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں اور ہر شخص کسی ضرورت کے وقت بعض الفاظ کے ترجمے اور مفہوم کا محتاج ہو سکتا ہے۔ اسی ضرورت کو پورا کرنے میں یہ لغت آپ کو مدد دے گی۔ چالیس ہزار سے زائد الفاظ، ضروری محاورات، ضرب الامثال اور اصطلاحات، روزانہ کی گفتگو میں کام آنے والے انگریزی الفاظ کے معانی۔ لفظ کس زبان کا ہے اور مذکر ہے یا مؤنث ان تمام تشریحات کے باوجود قیمت صرف مجلد تین روپے۔

اصح السیر

حضورؐ کی سیرت پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں مختصر بھی اور ضخیم بھی متوسط ضخامت کی کتب سیرت میں مولانا دانا پوری کی یہ کتاب اپنا جواب نہیں رکھتی شگفتہ زبان سلیس پیرایہ، اعلیٰ تحقیق، مآخذ کے حوالے اور مختلف فیہ واقعات و روایات میں محتاط موازنہ اور تنقید عوام و خواص دونوں کے لئے یہ کتاب نہایت مفید اور معلومات کثیرہ کا خزانہ ہے۔ قیمت مجلد ـــ بارہ روپے۔

سوانح قاسمی

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے قلم سے، عالم ربانی اور فاضل اجل مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تفصیلی سوانح حیات ان کے علم و فضل، فراستِ ایمانی، جذبۂ جہاد، اخلاقِ فاضلہ اور دینی و ملکی خدمات کا سیر حاصل تذکرہ۔ تین جلدوں میں مکمل۔ قیمت چودہ روپے پچاس پیسے۔ اگر ہر جلد مجلد چاہیں تو فی جلد ڈیڑھ روپیہ۔ یعنی تینوں جلدوں پر ساڑھے چار روپے بڑھا لیں۔

مکتبہ تجلی ـ دیوبند (یو۔پی)

چند بیش قیمت تحفے

مسند امام اعظمؒ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ فقہ حنفی اور حدیثِ رسولؐ میں کتنا گہرا اور بنیادی ربط ہے۔ ۵۲۳ احادیث کا یہ ذخیرہ فقہی ترتیب پر جمع کیا گیا ہے جس سے ہر خاص و عام کو مطلوبہ مسئلہ دیکھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ کتاب کے آغاز میں مولانا عبدالرشید نعمانی کا لاجواب مقدمہ بھی ہے اور علامہ قاری احمد کے قلم سے امام ابوحنیفہؒ کے حالات بھی۔ ایک کالم میں عربی مع اعراب۔ دوسرے کالم میں اردو ترجمہ قیمت مجلد دس روپے پاکستانی مطبوعہ ساڑھے دس ۱۰/۵۰ روپے

محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے ائمہ اربعہ، ارباب صحاح ستہ اور امام طحاویؒ کا تحقیقی تذکرہ۔ تاریخ تدوین حدیث اور جمع حدیث کیلئے ان کی کوششوں کا ذکر۔ ان کی تصانیف پر مفصل و سیر حاصل تبصرہ۔ قیمت ساڑھے چار روپے ۴/۵۰

خیر المجالس حضرت خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلویؒ کے پاکیزہ ملفوظات۔ سلوک و طریقت کا نچوڑ معارف و اسرار کا عطر۔ سات روپے ۷/۵۰ پیسے۔

بدعت کیا ہے؟ نیا اضافہ شدہ جدید ایڈیشن بدعت و معصیت کے رد میں ایک عظیم کتاب۔ قیمت مجلد تین روپے ۳/-

ملفوظات مولانا محمد الیاسؒ موجودہ صدی کے اولیاء و مشائخ میں مولانا محمد الیاسؒ ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ آپ کے قیمتی ملفوظات مولانا محمد منظور نعمانی نے اس لئے جمع فرمائے کہ ان میں عرفان و حکمت کے موتی جگ مگ کرتے ہیں۔ مجلد ڈھائی روپے ۲/۵۰

نبی و صدیق نبی کریمؐ اور صدیق اکبرؓ کی سیرتوں میں مشابہت کے دو سو ایمان افروز مناظر۔ اندازِ تحریر دلچسپ۔ مواد تحقیقی۔ قیمت تین روپے ۳/-

فضائل صحابہؓ اور اہل بیتؓ فقیہ و محدث حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کے افاضاتِ عالیہ۔ بیش بہا مطالب اور علوم و فنون کا گنجینۂ نفیس نکتے۔ عالی مضامین۔ قیمت چھ روپے ۶/-

تاریخ فقہ علامہ شیخ محمد خضریؒ کی قیمتی کتاب۔ تشریع الاسلامی کا اردو ترجمہ۔ اس میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دورِ مبارک سے لیکر آج تک کے تمام ادوار کی فقہ اسلامی کا محققانہ جائزہ لیا گیا ہے اور چاروں ائمہ اور ان کے شاگردوں کے احوال و کوائف اور علمی کارناموں کا تذکرہ سپرد قلم کیا گیا ہے۔ قیمت مجلد نو روپے ۹/-

حضرت محمد صلعم ایک ہندو اہل قلم جناب پرکاش دیو کی لکھی ہوئی سیرتِ رسولؐ جو اپنے حسن ترتیب اور مواد کے اعتبار سے ان کے سلیقے تلاش اور حسنِ نظر کی آئینہ دار ہے۔ قیمت سوا روپیہ ۱/۲۵

براہین قاطعہ بدعات کے رد میں ایک شہرۂ آفاق کتاب طرح طرح کی مروجہ بدعتوں کے حق میں جو دلائل اہل بدعت دیتے رہتے ہیں ان کا لاجواب رد اور صحیح عقائد کا بیان۔ قیمت پانچ روپے ۵/-

حسینؓ و یزیدؒ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ کا ایک قیمتی تبصرہ اردو لباس میں۔ پچاس پیسے ۵۰/-

حیات المسلمین ہر مسلمان کو زندگی گذارنے میں کن امور کا خیال رکھنا چاہیئے۔ کونسی چیزیں ہیں جو اس کی حیات کو کسی غیر مسلم کی حیات سے ممتاز کرتی ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علیؒ نے اسی پر روشنی ڈالی ہے۔ قیمت مجلد ایک روپیہ پچاس پیسے ۱/۵۰

مکتبہ تجلی دیوبند (یو۔پی)

Monthly KAJALLY DEOBAND U.P. REGD. NO. L 97

سرمہ کا بادشاہ

دُرِ نجف

طب قدیم کا ایک نادر شاہکار

• اسکا استعمال آخر عمر تک بینائی کا تحفظ اور امراض کی مدافعت کرتا ہے۔

• رات کو استعمال کیجئے تو دن بھر اپنی آنکھوں میں تروتازگی اور نکھار محسوس کریں گے

• بغیر کسی مرض کے بھی اسے استعمال کرتے رہئے نگاہ نہ گرے گی نہ تھکے گی۔

• دُکھتی ہوئی آنکھوں کے پپوٹوں پر سوتے وقت اسکا لیپ کیجئے آپ دیکھیں گے کہ اگلی ہی صبح کتنا نمایاں فائدہ نکلتا ہے

انتہائی خوبی یہ ہے کہ اپنے بیش بہا فوائد کے باوجود یہ آنکھوں میں لگتا اور کرکتا نہیں ہے بلکہ سکون اور ٹھنڈک پہنچاتا ہے

شرمے کے ساتھ ہماری مخصوص جستی سلائی ۱۵ آنے میں طلب کیجئے

ایک تولہ 6/-

۶ ماشہ 3-5/1/-

محصول و پیکنگ ڈیڑھ روپیہ

کوئی سی بھی تین شیشی ایک ساتھ منگانے پر محصول و پیکنگ معاف

تاجر حضرات شرائط ایجنسی طلب فرمائیں

دار الفیض رحمانی۔ دُرِ نجف بلڈنگ۔ دیوبند یو۔ پی DEOBAND U.P.

تفسیر سورۂ نور — اس شاہکار تفسیر میں ائمہ و اتقیاء کے بہترین اجتہادات جمع کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ قرآن و سنت کے اصول سے فروعات کا استنباط کیونکر ہوتا ہے۔ اسلامی اخلاق کی بنیادی تعلیمات پر مشتمل سورۂ نور کی یہ تفسیر ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ از۔ مولانا مودودی

قرآن اور حدیث — قرآن اور حدیث میں کیا ربط ہے؟ ۔ حدیث کو حجت ماننا کیوں ضروری ہے؟ ۔ تنہا قرآن کیوں ہدایت کیلئے کافی نہیں؟ ۔ اس نوع کے سوالات کا شافی و کافی جواب۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے قلم سے۔ ڈیڑھ روپیہ۔

بدعت کیا ہے؟ — (نیا اضافہ شدہ ایڈیشن) بدعت و معصیت کے رد میں ایک عظیم کتاب جو قرآن و حدیث اور عقل و منطق کے اٹل دلائل کے ذریعے صحیح ترین اسلامی عقائد کو واضح کرتی ہے —— تمام بدعات کیلئے ضرب کلیم۔ قیمت مجلد تین روپے۔

بلاغ المبین — بدعت و شرک کے خلاف اور سنت و توحید کی حمایت میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی شاندار کتاب کا اردو ترجمہ۔ روشن دلائل۔ نفیس تنقیحات۔ مجلد چار روپے۔

وجد و سماع — مروجہ عرس و قوالی اور گانے بجانے کی شرعی حیثیت پر حرف آخر قیمت ایک روپیہ

تزکیۂ نفس — مولانا امین احسن کی معرکۃ الآرا تالیف۔ تزکیۂ نفس کی حقیقت اور وہ کس طرح پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ ایڈیشن چھ روپے

مکتبہ تجلی۔ دیوبند (یو۔پی)